طورخم سے کوہ قاف تک
روس کے تعاقب میں
تالیف
مولانا امیر حمزہ

فہرست

روس کے تعاقب میں

روس کی سیر

قازان سے آستراخان تک

کوہ قاف کی امام شام کے دیس داغستان میں

قازقستان، ترکمانستان، بخارا اور سمرقند کی قلم بند یادیں

اور اب دلی کے تعاقب میں (ان شاء اللہ)

افغانستان سے جب روس بھاگا تو میں نے طورخم سے دریائے آمو تک افغانستان دیکھا ..... تب جہاد کی برکتوں کو ..... اسلام اور مجاہدین کی عزتوں کی شکل میں جس انداز سے ہم نے دیکھا ..... اور پھر وہ ایسا بھاگا کہ وسط ایشیا کی پانچ ریاستوں سے بھی بھاگ کھڑا ہوا ..... میں اس کے پیچھے گیا اور تاریخ کے اس اہم ترین موقع پر روس کی ذلتوں اور مجاہدین کی عظمتوں کو تاریخ میں محفوظ کر دیا ..... میں ماسکو بھی گیا اور چیچنیا سے آگے تک گیا ہر سو اسلام کی عظمتوں کو دیکھا؟

یہ سارے نظارے آج بھی مجاہدین کو ولولہ تازہ دیتے ہیں ..... کہ جب تک جہاد جاری ہے ..... اور جہاد قیامت تک جاری رہے گا ..... کسنجر اور نکسن جو امریکہ کے بڑے مدبر تھے دونوں مر چکے ..... انہوں نے جب یہ صورت حال دیکھی تو پھر ایک لمبی سازش تیار کر کے مجاہدین کو باہم لڑا یا۔ کہیں مجاہد لیڈروں کو مروا یا۔ روس کے ساتھ ایکا کر کے مجاہدین کو بدنام کرنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی ..... اس نے جہاد کے ثمرات کو ضائع کرنے کے لیے پیسہ پانی کی طرح بہایا۔

کشمیر میں جہاد کا جو فیصلہ کن موڑ آ چکا ہے اب کیا ہم نے افغانستان کے واقعات سے سبق لیتے ہوئے دلی سے آگے تک جانا ہے؟ ..... یا کہ کشمیر تک ہی محدود رہنا ہے۔ عزتوں کا سفر اختیار کرنا ہے یا کہ ذلتوں کی گہرائیوں میں گرنا ہے۔ یہ دونوں اور ان کے راستے آج ہمارے سامنے واضح ہیں۔

زیر نظر سفر نامہ ''روس کے تعاقب میں'' جو مشاہدات پر مشتمل ہے ..... یہ مشاہدات درس دے رہے ہیں کہ اے مجاہدین کشمیر دلی کے تعاقب کا جب مرحلہ آئے تو دیر نہ کرنا اور پھر وہ ساری برکات حاصل کرنا جن کی ایک جھلک آپ ''روس کے تعاقب میں'' دیکھ سکتے ہیں۔

امیر حمزہ

عرض ناشر

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ وَ الْمُرْسَلِیْنَ . اَمَّا بَعْدُ !

"روس کے تعاقب میں" مولانا امیر حمزہ ﷾ کا سفرنامۂ روس ہے۔ ایک وقت تھا کہ روس دنیا میں سپر پاور تھا، جس طرف قدم اٹھاتا تھا بڑھتا ہی جاتا تھا، روسیوں نے طاقت کے نشہ میں نہ صرف مسلمانوں کا قتل عام کیا بلکہ اللہ رب العزت کا بھی انکار کر دیا، ہر مذہب کا انکار کر کے دہریت کا نیا مذہب ایجاد کیا۔ اسی طاقت کے نشہ میں چور جب روس نے پاکستان کے گرم پانیوں پر قبضہ کرنے کے لیے افغانستان پر چڑھائی کی تو افغان بھائیوں نے روس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا پھر افغانیوں کے ساتھ پاکستانی اور دیگر مسلمان ملتے گئے اور روس کی بربادی کا ذریعہ بنتے گئے۔

افغان جہاد کے نتیجہ میں جب اللہ تعالیٰ نے روس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور کروڑوں مسلمانوں کے علاوہ دیگر اقوام بھی روسی تسلط سے آزاد ہوئے۔ مسجدیں اور مدرسے جو کل شراب خانے اور سینما گھر بنا دیے گئے تھے، دوبارہ سے **"اللہ اکبر"** کی صداؤں سے معمور

ہونے لگے۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ نے امیر حمزہ ﷾ کو توفیق دی اور انھوں نے ''طورخم سے کوہ قاف تک'' کا سفر کیا، جہاد کے ثمرات کا مشاہدہ کیا اور اپنی آنکھوں کے سامنے دنیا سے کمیونزم کا جنازہ اٹھتے اور اسے دفن ہوتے ہوئے دیکھا۔ چنانچہ انھوں نے زیرِ نظر سفر نامہ میں ثمرقند و بخارا کے ماضی و حال پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

جو **''روس کے تعاقب میں''** کے نام سے شائع ہوا، اب اسے نئی تزئین و آرائش کے ساتھ **''دارالاندلس''** کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔ جہاد کی برکات سے ایسے ہی سپر طاقتیں بکھرتی اور اسلام غالب آتا ہے۔ اللہ سمجھ عطا فرمائے۔ آمین!

محمد سیف اللہ

مدیر **''دارالاندلس''**

۸ رجب ۱۴۲۵ھ

افغانستان اور روس کا سفر

ایک تاریخی یادگار......اسلامی عظمت کا لازوال نشان

قارئین کرام! میں نے افغانستان کا سفر ''طورخم سے دریائے آمو تک'' اس وقت کیا جب روسی نکل کر بھاگ گئے ہی تھے اور مجاہدین نے کنٹرول سنبھالا ہی تھا اور روس کا سفر بھی اس کے بعد فوراً کیا کہ جب وسط ایشیا کی پانچ ریاستیں ازبکستان، تاجکستان، قازکستان، ترکمانستان اور کرغستان آزاد ہوئیں۔ مجھے اول الذکر چار ریاستوں میں جانے کا اتفاق ہوا، پھر ماسکو تک گیا، ماسکو کے بعد ''قازان سے آستراخان'' تک ''تاتارستان'' کو دیکھا اور پھر ''کوہ قاف'' کے علاقوں چیچنیا، داغستان اور آذربائیجان تک گھوما، دریائے وولگا میں پانچ دن کا بحری سفر بھی کیا اور بحر قزوین کے کنارے پر بھی گھوما۔ ان دنوں روس افغان جہاد کی برکت سے ٹوٹ پھوٹ رہا تھا، میں نے ان برکتوں کو جس طرح سے ان تمام علاقوں میں دیکھا وہ سب اس وقت آپ کے سامنے ہیں۔

اس دوران میں نے جو محسوس کیا، سچی بات یہ ہے کہ اگر افغان مجاہدین افغانستان کی فتح کے بعد دریائے آمو پار کرتے اور دنیا بھر کے مسلمان مجاہدین کہ جو افغانستان میں موجود تھے، وہ بھی ان کے ہم رکاب ہوتے تو وہ وقت قریب ہوتا جب یہ ماسکو کے کریملن میں ''لینن'' کی لاش کے ٹکڑے کرتے، مگر یہ جہاد چھوڑ بیٹھے اور آپس میں ہی گتھم گتھا ہو گئے، تاہم اس سب کے باوجود آپ میرے ساتھ ساتھ چلیے!

آپ دیکھیں گے کہ جہاد نے کس طرح مسلمانوں کو عزت سے ہمکنار کیا اور یہ کہ اگر ہم اسی طرح اسلام کا غلبہ اور اس کے ماننے والوں کو عزت وعظمت سے ہمکنار کرنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ جس کی طرف اللہ کے رسول ﷺ نے چل کر دکھایا اور آج افغانستان میں ہم نے اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیا اور اس خوبصورت تجربے کا نام، جی ہاں! جہاد ہے اور اس قتال کہتے ہیں۔

امیر حمزہ
مدیر ہفت روزہ ''غزوہ''

طورخم

پشاور سے ہم جمرود روڈ پر چلے تو تھوڑی دیر بعد "باب خیبر" پھر "لنڈی کوتل" اور گھنٹہ بھر سفر کیا ہوگا کہ پاکستان اور افغانستان کی سرحدی چوکی "طورخم" پر جا پہنچے۔

"طورخم" کا پھاٹک ہی وہ درہ ہے کہ جو تاریخ میں "خیبر" کے نام سے معروف ہے۔ غزنوی، غوری، لودھی اور بابر غرض جو بھی ہندو پر حملہ آور ہوا اسی درے سے ہو کر حملہ آور ہوا۔ مگر تب ہندو رہا کرتے تھے آج اس درے کے پار مسلمانوں کا ملک پاکستان آباد ہے۔ اور روس نے بھی اسی درے سے گزرنا چاہا مگر اسے اس درے سے دور ہی روک دیا گیا حتیٰ کہ وہ یہاں سے بھاگ اٹھا۔ اور آج اس درے پر طورخم کی اس چوکی پر پاکستانی اور افغانی ادھر ادھر آجا رہے ہیں، نہ کوئی ویزا ہے نہ پاسپورٹ، بس ایک ہی نشان ہے، ایک ہی پہچان ہے اور اس کا نام اسلام ہے۔ یہ تبدیلی، یہ بھائی چارہ، یہ اخوت و محبت ہجرت و جہاد کی برکت سے ہے۔ بارہ سالہ جہاد نے مصنوعی لکیر کو خوب بے اثر کیا ہے۔ کاش! پوری دنیا کے مسلمان ملکوں میں یہ مصنوعی لکیریں مٹ جائیں اور یہ ایک امت عقیدہ اور عمل میں عملی طور پر "امت واحدہ" کا نقشہ پیش کرے۔

"طورخم" سے تقریباً نصف گھنٹے کے بعد افغانستان کا خوبصورت اور میدانی باغ "ثمرخیل" آگیا ہے، یہ زیتون کے باغات ہیں، انہی باغات میں واقع "معسکر طیبہ" میں کچھ عرصہ کے لیے جہاد کی تربیت دی جاتی رہی۔ اس باغ کا نظارہ کرتے اب ہم آگے بڑھ چکے تھے۔

جہاد کی باتیں، جہاد کی یادیں

جلال آباد:

سات مئی کو میں اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ پشاور سے جلال آباد پہنچا، جلال آباد افغانستان کے صوبہ ننگر ہار کا دارالحکومت ہے اور پشاور سے ۷۴ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ہم اس شہر میں سب سے پہلے اس شاہی مسجد میں گئے کہ جو دو تین روز قبل تک سیل بند تھی مگر اب اس کے دروازے کھل چکے تھے،لینن ومارکس کی کتابوں کی بجائے اب اس میں سعودی عرب کے چھپے ہوئے قرآن مجید موجود تھے۔

جلال آباد شہر کی وہ سڑک کہ جو طورخم کے راستے پشاور کو جاتی ہے، اس پر عبدالولی خان کے باپ عبدالغفار خان کا مقبرہ ہے، باچا خان نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ مجھے غلام ملک میں دفن نہ کیا جائے، آزاد ملک میں دفن کیا جائے، یعنی اس کی نظر میں پاکستان غلام تھا، اس لیے کہ اس پر کمیونسٹوں کا دشمن ضیاء الحق حکمران تھا اور افغانستان آزاد تھا، اس لیے کہ اس ملک میں روسی درندے افغان مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہے تھے......بہرحال عبدالغفار خان کے آزاد ملک میں اسے دفن کر دیا گیا......مگر آج عبدالولی کے باپ باچا خان کے بقول یہ ملک بھی پاکستان کی طرح غلام بن گیا ہے اس لیے کہ ضیاء الحق کے ساتھی آج وہاں فاتحانہ داخل ہوئے ہیں۔لہٰذا میں نے دیکھا کہ بڑے خان عبدالغفار خان کا مقبرہ غلام بن چکا تھا، میں جب وہاں گیا تو وہ سیل بند تھا، محافظ موجود تھے، اندر کسی کو جانے نہ دیتے تھے۔ہم نے پوچھا بھئی کیوں نہیں جانے دیتے تو وہ محافظ کہنے لگے اس لیے کہ کوئی بم دھماکا کر کے باچا

خان کے مقبرے کو اڑا نہ دے۔میرے ہم سفر ساتھی ابو شرحبیل نے کہا یہ تو پاکستان کے ایک رسالے کے ایڈیٹر ہیں انھیں تو اندر جانے دیں۔ بہر حال اس کے باوجود بھی بڑی مشکل سے مانے اور ہمارے لیے انھوں نے مقبرے کا قفل کھولا ۔با چا خان نہ سن سکتے تھے نہ میں انھیں سنا سکتا تھا، اس لیے کہ اللہ تعالی اپنی کتاب میں ہمیں باخبر کرتے ہیں:

وَمَآ أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي ٱلْقُبُورِ ﴿٢٢﴾ (فاطر:۲۲)

''اور آپ قبروں میں پڑے لوگوں کو نہیں سنا سکتے۔''

وگرنہ دل تو چاہتا تھا کہ باچا خان کو سناؤں کہ خان صاحب! افغانستان تو غلام بن گیا ہے اب کیا پروگرام ہے؟ یہیں رہنے کا ارادہ ہے یا کہ کہیں اور جانے کا پروگرام ہے؟ بہر حال باچا خان کو تو ہم کہنے سے رہے ان کے فرزند ارجمند خان عبدالولی خان کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اب باچا خان جیسے آزاد انسان کو غلام ملک افغانستان میں نہیں رہنے دینا چاہیے، کسی آزاد ملک میں منتقل کرنے کا پروگرام بنانا چاہیے، مگر یہ مشورہ دیتے ہوئے ہمیں یہ خدشہ بھی ہے کہ اگر پاکستان کے ایک اور پڑوسی آزاد ملک بھارت میں خان صاحب کا مقبرہ بنایا گیا تو افغانستان والا عمل تو اب کشمیر میں بھی جاری ہے تو کل کو ہندوستان بھی غلام ہوجائے گا تو پھر باچا خان کو کہاں لے جایا جائے گا؟

بہر حال خان عبدالولی خان آج کل افغانستان کے غلام بننے کے بعد باچا خان کے بارے میں سخت پریشان ہیں اور وہ اس پریشانی کا اظہار افغان مجاہدین کو گالیاں دے کر کر رہے ہیں۔

خان صاحب کو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ مجاہدین کو گالیاں دینے سے پریشانی دور نہیں ہوگی بلکہ اس کے لیے اگر کسی دربار کے گدی نشین سے رابطہ کر لیا جائے تو آپ کی پریشانی دور ہوسکتی ہے،کوئی خانقاہی پیر یہ مشورہ دے سکتا ہے کہ خان صاحب ایک بیان اس طرح کا دے دیں کہ باچا خان جو کہ آخر عمر میں ولایت کی بلند وبالا منزلوں پر پہنچ گئے تھے، انھوں نے ہمیں خواب میں بتلایا ہے کہ میں نے افغانستان کی غلامی کے بعد جلال آباد سے ہجرت کر لی ہے اور

میں آزاد ہندوستان کے فلاں شہر کے فلاں مقام پر راتوں رات پہنچ گیا ہوں، لہٰذا وہاں میرا مقبرہ تعمیر کردو...... ہمارا خیال ہے کہ اس طرح شاید ولی خان بھی پریشانی سے بچ جائیں اور مجاہدین کو بھی کمیونسٹ دور کی ایک تلخ یاد سے نجات مل جائے اور پھر جب کل کو انڈیا بھی غلام بن جائے تو اسی ولایتی طریقے سے خان صاحب اور آگے اور پھر اس سے بھی آگے سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔

شہداء کی یادیں:

خان عبدالولی خان صاحب کے بارے میں مجلۃ الدعوۃ کے ذریعے مشوروں کی یہ لڑی ذہن میں پرونے اور ان تک پہنچانے کے بعد ہم کابل کی طرف سے آنے والے اور جلال آباد کے پہلو سے ہو کر کنڑ کو چلے جانے والے دریا پر بنے ہوئے "بسود پل" کی طرف چلے گئے، جب مجاہدین نے جلال آباد کا محاصرہ کیا تھا اور اس محاصرے کے لیے جن پہاڑوں پر مورچے بنائے تھے، وہ پہاڑ اب ہمارے سامنے تھے، یہ سامنے گھمبیری کے پہاڑ ہیں۔یہاں کمیونسٹوں کی ایک پوسٹ تھی جس کا نام مجاہدین نے عورت پوسٹ اس لیے رکھا تھا کہ یہاں عورتیں لڑتی تھیں اور یہ ان ملحدوں کی شیطان پوسٹ تھی۔ اس طرف کو کامہ پل ہے، یہ قادسیہ ہے، اس مورچے کا نام حطین ہے۔ یہ مجاہدین کے رکھے ہوئے نام تھے اور یہی وہ پہاڑ اور مورچے تھے جہاں نذیر ابوبکر شہید ہوا، جہاں خالد سیف شہید ہوئے، مولانا قاری عبدالحفیظ فیصل آبادی کے صاحبزادے ضیاء الحفیظ شہید ہوئے، غرض ان پہاڑوں کو سامنے دیکھتے ہوئے ماضی کی یادیں تازہ کرتے ہوئے پل سے پار ان پہاڑوں کے دامن میں ایک افغان بھی آ گیا، پانی پیا اور پھر جہاد کی باتیں شروع ہو گئیں۔ بوڑھا افغان کہنے لگا میں ہجرت نہیں کر سکا، ہم یہیں بیٹھے رہے، مجاہدین کے گولے ہمارے اوپر سے گزر کر جلال آباد میں گرتے اور کمیونسٹوں کے گولے بھی ہمارے اوپر سے گزر کر ان پہاڑوں پر گرتے۔عربوں کے بارے میں وہ اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہنے لگا کہ روسی اور افغانی کمیونسٹ ان سے بہت ڈرتے تھے اور عرب اس قدر دلیر تھے کہ وہ بسا اوقات پہاڑوں سے اتر کر یہاں ہمارے گھر

کے قریب آجاتے، میں نے کئی دفعہ انھیں کھانا کھلایا۔

جلال آباد کا محاصرہ اور شیخ جمیل الرحمٰن:

میرا ہم سفر ساتھی مجھے جلال آباد کے حوالے سے امارت اسلامی کنڑ کے بانی شیخ جمیل الرحمٰن شہید رحمہ اللہ کے ساتھ ہونے والی ایک نشست کی روداد سنانے لگا کہ جب جلال آباد کے محاصرے کو دو سال کا عرصہ ہونے کو آیا، محاصرہ طویل ہوگیا تو ایک روز چند عرب ساتھیوں نے مجھے بھی ساتھ لیا اور باجوڑ ایجنسی پاکستان میں شیخ جمیل الرحمن شہید سے ملاقات کے لیے چلے گئے۔ ہر مجاہد اس طویل محاصرے پر بڑا برہم تھا اور وہ چاہتا تھا کہ شیخ سے بھر پور حملے کی اجازت ملنی چاہیے۔ بہر حال شیخ نے ہر مجاہد کی بات سنی، جب سب مجاہد اپنی اپنی بات تفصیل سے سنا چکے تو شیخ نے کہا اصل بات یہ ہے کہ ہمارا مقصد محض علاقے فتح کرنا نہیں بلکہ جس علاقے کو فتح کیا جاتا ہے ہماری شرعی ذمہ داری بن جاتی ہے کہ ہم مفتوحہ علاقے میں اللہ کے قانون کا نفاذ کریں، وہاں کے لوگوں کے مسائل اور مصائب کا مداوا کریں۔ اگر ہم یہ کام کرسکیں تو ٹھیک وگرنہ جو علاقے ہمارے پاس پہلے موجود ہیں وہاں ہمیں اپنی شرعی ذمہ داریاں بخوبی نباہنے کے بعد آگے بڑھنا ہوگا اور انھوں نے یاد دلایا کہ دشمن کے محاصرے میں بیٹھے رہنا بھی تو جہاد ہی ہے۔ غرض شیخ کی یہ بصیرت افروز گفتگو سن کر سب مجاہد مطمئن ہوگئے اور آج جلال آباد کی فتح کے بعد شیخ کی یہ بصیرت عملی طور پر سامنے دکھائی دے رہی تھی کہ تمام بڑے شہروں کے طویل محاصروں نے ہی بالآخر کمیونسٹوں کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔

جلال آباد میں شاہی باغ کی سیر کو نکلے تو سامنے غازی امان اللہ کا باغ تھا، اسی میں ان کے والد امیر حبیب اللہ خان کی قبر ہے، جنھوں نے افغانستان پر ۱۹۱۹ء سے تک حکمرانی کی، اپنے باپ کے ساتھ دفن ہیں اور ساتھ ہی امان اللہ کی بیوی ملکہ ثریا کی قبر ہے۔ یہاں سے ہوکر ہم جلال آباد کے مرکزی بازار میں رات گزارنے کے لیے مسافر خانے کی تلاش میں تھے کہ ایک مجاہد نے پہچان لیا اور پھر وہ یہیں ایک گھر میں لے گیا جو کسی کمیونسٹ کی کوٹھی تھی۔ رات ہم نے یہاں گزاری اور صبح سویرے کابل کی طرف چل دیے۔

سوئے کابل:

جلال آباد سے ہماری بس سات بجے روانہ ہوئی، تقریباً پانچ چھ کلومیٹر تک یعنی دریائے کابل پر بنے ہوئے ڈیم تک وادی کھلی اور شاداب ہے، گھنے درختوں میں کچھ لوگ بھی دکھائی دیے مگر اس کے بعد کابل کے ضلعی صدر مقام سروبی تک ہمیں بیسیوں بستیوں میں ایک بستی بھی ایسی دکھائی نہیں دی جس کا کوئی ایک گھر بھی محفوظ ہو جبکہ سڑک کے کئی پل ٹوٹے ہوئے اور سڑک اس قدر ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی کہ کابل تک چھ گھنٹوں میں ہڈی پسلی ایک ہو گئی اور پھر جو روسی بربادی کے نشانات تھے وہ دریائے کابل کے ساحل، سڑک کے کنارے اور پہاڑوں کے دامن میں اس قدر زیادہ تھے کہ جلال آباد سے کابل تک وہ جہاں مجاہدین کی عظمت اور قربانیوں کی یاد دلاتے ہیں وہاں وہ روسی تباہی کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ٹینک، بکتر بند گاڑیاں، جیپیں اور بڑے روسی ٹرک اس تعداد میں تباہ وبرباد بکھرے پڑے ہیں کہ ان کی تعداد لاکھوں میں اگر شمار کریں تو میرے خیال میں مبالغہ نہ ہوگا۔ بڑی گاڑیوں اور جیپوں کا حال تو یہ ہے جیسے کسی نے کھلونوں کو ہاتھ سے توڑ مروڑ کر اور آگ میں جھلسا کر پھینک دیا ہو، یہ سکریپ جو ٹنوں کے حساب سے یہاں پڑا ہے اس میں نہ جانے کتنا اٹھا لیا گیا، کتنا دریا کی نذر ہوگیا اور جو دکھائی دیتا ہے اس کا بھی شمار نہیں، ٹینک کہیں اوندھے منہ دریا کے کنارے پڑے ہیں، کہیں بکتر بند گاڑیاں چڑمڑ ہو کر سپر پاور روس کے چڑمڑ ہونے کی داستان سناتی ہیں۔

جب سروبی شہر آیا تو مجھے مرکز الدعوۃ والارشاد کا مجاہد ساتھی عبدالرؤف شدت سے یاد آیا کہ جو اس شہر کے قریب دریائے کابل کے کنارے شہید ہوا تھا، آج کابل کے دروازے مجاہدین پر کھلے ہیں، فتح نے ان کے قدم چومے ہیں اور ہم آج کابل کی طرف جا رہے تھے تو اس میں جہاں دیگر بے شمار شہداء کا خون شامل ہے وہیں عبدالرؤف کا خون بھی شامل ہے جو سڑک سے ہٹ کر دشوار گزار پہاڑ اور وادیاں عبور کر کے کابل پر حملہ کرنے یہاں تک آیا تھا۔ اللہ اس کی شہادت کو قبول فرمائے کہ وہ شیخ الحدیث عبدالرشید ہزاروی کا فرزند ارجمند اور

ایک نوجوان عالم دین تھا۔

پل چرخی جیل:

اب ہمارے سامنے **پل چرخی** جیل تھی، یہ **کابل** سے بیس **کلومیٹر** کے فاصلے پر ہے، افغانستان کی یہ سب سے بڑی اور قیدیوں پر تشدد کے لیے معروف اور انتہائی بدنام جیل ہے۔ مگر اب یہ خالی ہو چکی تھی، اس میں کوئی ایک قیدی بھی نہ تھا، یہاں مجاہدین بھی تھے اور الذوالفقار کے تخریب کاروں سمیت کمیونسٹ بھی۔ الذوالفقار کے وہ پاکستانی نوجوان تھے کہ جنھیں ضیاء حکومت کے خلاف کارروائیوں کے لیے یہاں **لایا** گیا اور ٹریننگ دی گئی پھر انھیں پاکستان میں بم دھماکے کرنے کو کہا گیا تو جنھوں نے انکار کیا انھیں اس جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ اسی طرح افغانستان میں کمیونسٹوں کی دو پارٹیاں تھیں خلق اور پرچم۔ ان میں سے ایک پارٹی اقتدار میں آتی تو دوسری پارٹی کے **لوگوں** کو جیل میں ڈال دیتی۔ اس جیل میں ظلم وستم کے ایسے ایسے عجیب وغریب طریقے اختیار کیے جاتے تھے جن سے گزرنے کے بعد کئی **لوگ** مر جاتے اور جو باقی بچتے وہ حواس کھو بیٹھتے تھے۔ اس قید سے جو رہا ہوئے ہیں ہر ایک کی ایک الگ داستان ہے جو خون کے آنسو رلاتی ہے۔ تاہم یہاں صرف ایک عرب قیدی ابو جہاد کی داستان ہم آپ کو سنائے دیتے ہیں۔

پل چرخی کے ایک قیدی کی داستان:

ہم جلال آباد میں مصروف جہاد تھے، ہمیں خبر ملی کہ دشمن نے ایک بڑی تیاری کے ساتھ عرب بھائیوں کے مورچوں پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ چنانچہ صبح ہوتے ہی ہوائی جہازوں نے ہمارے مورچوں پر شدید بمباری شروع کر دی، اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ ٹینکوں کی بہت بڑی تعداد ہماری طرف بڑھ رہی ہے، ہم نے اپنا دفاع اور دشمن کو روکنے کا پروگرام بنایا مگر ٹینکوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور اس حملے کو روکنے کے لیے خط اول پر ہمارے پاس بھاری اسلحہ کم تھا تو امیر جہاد نے ہمیں جبل قبا کے پیچھے چلے جانے کو کہا۔ چنانچہ

ایک گروپ دشمن سے مزاحم ہوتا رہا جبکہ باقی گروپ بحفاظت محفوظ جگہ چلے گئے۔ اب آخر میں ہمارا گروپ تھا جسے محفوظ جگہ پہنچنا تھا، اوپر سے ہم پر جہازوں کی بے پناہ بمباری تھی اور سامنے دشمن سر پر چڑھا ہوا تھا اور اسلحہ ہمارے پاس کم تھا، میں اب بہت زیادہ تھک بھی چکا تھا، چنانچہ میں نے اپنا کچھ اسلحہ اپنے ایک ساتھی کو دے دیا۔ ہمارے پاس صرف ہلکا اسلحہ باقی تھا، ٹینک شکن نہ تھا، چنانچہ میں بوجھ سے ذرا ہلکا ہوکر واپس پلٹنے لگا تو سومیٹر کے فاصلے پر میرے سامنے ایک ٹینک تھا جو تیزی سے میری طرف بڑھ رہا تھا، میں دوسری سمت گھوما تو اس جانب بھی ایک ٹینک تھا۔ اب دونوں ٹینک میری طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے اور میرے پاس ٹینکوں کے مقابلے میں اپنے دفاع کے لیے مطلوبہ اسلحہ راکٹ لانچر وغیرہ نہ تھا۔ چنانچہ میں نے سمجھ لیا کہ یہ ٹینک مجھے اپنے نیچے کچل کر پریس کر دے گا اور میں نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا مگر ایک ٹینک میرے قریب آ کر کھڑا ہوگیا، اس سے ایک فوجی باہر نکلا اور اس نے مجھ سے پوچھا کیا تو مجاہد ہے؟ میں نے کہا میں عربی ہوں۔ چنانچہ اس نے دوسرے آدمی کو بھی بلا لیا اور انھوں نے مجھے ٹینک کے اندر داخل کر دیا۔

پھر یہ لوگ پہاڑ کی ایک سرنگ میں مجھے لے گئے جہاں جلال آباد میں موجود فوج کے بڑے بڑے آفیسر تھے اور جب انھیں معلوم ہوا کہ جسے گرفتار کیا گیا ہے وہ عربی ہے تو وہ سب باری باری مکوں اور گھونسوں اور ٹانگوں کے ساتھ مجھ پر ٹوٹ پڑے اور ان میں سے ایک کانا تھا، وہ تو چیختا ہوا میری آنکھوں کی طرف اس طرح آگے بڑھا کہ وہ میری دونوں آنکھیں نکال لے گا۔ چنانچہ وہ مجھ پر پل پڑا اور میری دونوں آنکھیں نکالنے کی کوشش کرنے لگا مگر قبل اس کے کہ وہ یہ کام کر گزرتا ایک افسر نے آگے بڑھ کر مجھے اس سے چھڑوایا اور پھر انھوں نے مجھے ایک بکتر بند گاڑی میں جلال آباد شہر روانہ کر دیا۔

جب ہم جلال آباد میں پہنچے تو ایک افسر نے مجھے گاڑی سے نکالا اور سڑک کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا دیا اور پھر بلند آواز سے موجود لوگوں کو آواز دی: ''لوگو! دیکھو! یہ عربی وہابی ہے۔'' جو لوگ وہاں موجود تھے بڑی تیزی سے میرے گرد جمع ہونے لگے کہ دیکھیں تو سہی یہ

عجیب مخلوق کون ہے اور پھر ان میں سے ہر کوئی اپنی استطاعت کے مطابق مجھے پیٹنے لگا حتیٰ کہ مجھے اپنی موت نظر آنے لگی مگر قبل اس کے کہ میری روح میرے جسم سے جدا ہوتی انھوں نے مجھے ایک کار میں بٹھایا اور جلال آباد ایئر پورٹ پر لے گئے، وہاں ہوائی جہاز کے ذریعے کابل پہنچا دیا۔

خاد کے دفتر میں:

کابل میں مجھے خاد کے دفتر میں لے جایا گیا، وہاں عربی کا ایک مترجم منگوایا گیا اور دس روز تک میری تفتیش کرتے رہے اور پوچھتے رہے کہ کن کے ساتھ تو کام کرتا ہے، یہاں کیوں آیا، افغانستان میں داخل کیسے ہوا، کس ملک کے لیے تو جاسوسی کرتا ہے، افغانستان میں عربوں کی تعداد کتنی ہے، تمھارا امیر کون ہے وغیرہ وغیرہ؟ میں نے انھیں ان کے سوالات کے جوابات دیے مگر کوئی ایسی بات نہ بتلائی جس سے جہاد کو نقصان پہنچے۔ پھر وہ افسر جو کہ میری تحقیق و تفتیش کر رہا تھا مجھ سے مخاطب ہوکر کہنے لگا اچھا تو پھر تو مجاہد ہے مگر کہاں ہے جہاد؟ اور پھر جلادوں کو حکم دیا کہ وہ مجھے ماریں، پھر کچھ دن یونہی گزرنے کے بعد دوبارہ مجھے حاضر کیا گیا اور کہا کہ تو نے جو کچھ کہا وہ سب جھوٹ تھا اور پھر طرح طرح کی سزائیں اور ایذائیں پہنچانے کے بعد انھوں نے مجھے صحافیوں کے سامنے پیش کرنے کا پروگرام بنایا۔

ایک افسر میرے پاس آیا اور کہنے لگا صحافیوں کے سامنے پیش ہوجاؤ اور انھیں کہو کہ میں جاسوس ہوں اور میں جمہوری افغانستان کی جاسوسی کرنے کے لیے آیا ہوں اور یہ کہ مجاہدین اس وطن اور اس کی سرزمین کا سودا کرنے والے ہیں اور یہ کہ جہاد کو گالی دو اور مجاہدین پر لعنت کرو۔ چنانچہ میں صحافیوں کے سامنے پیش ہوگیا اور جو اللہ کو منظور تھا وہ میں نے کہا۔

اس کے بعد تیسری مرتبہ انھوں نے مجھے طلب کیا اور بعض ایسے جلادوں کے سپرد کیا جو بجلی کے جھٹکے اور دیگر طرح طرح کی ایذائیں دیتے تھے۔ اب میں ان کے ہاتھوں میں لاچار اور بے بس ہو چکا تھا، چنانچہ میں نے ان کی ایذاؤں سے بچنے کے لیے کہا کہ مجھے فلاں ملک نے

جاسوسی کے لیے بھیجا ہے وغیرہ وغیرہ.....تو اب وہ مجھے ایک بلڈنگ کے چھوٹے سے کمرے میں لے گئے ۔وہاں انھوں نے مجھے بٹھا دیا اور جج مجھ سے سوالات کرنے لگا تو میں نے ان سب باتوں کا انکار کر دیا جس کا میں نے فوجی افسروں کے سامنے اقرار کیا تھا اور کہا کہ یہ دباؤ اور ظلم کی وجہ سے اعتراف تھا۔ اب وہ سب مذاق کرتے ہوئے میری اس بات پر ہنسنے لگے اور کہنے لگے یہ تو تیری ریہرسل تھی کہ بھلا تو اصل عدالت کے سامنے جا کر کیا کہے گا؟

پھر ایک روز انھوں نے مجھے عدالت کے سامنے پیش کر دیا، میں جب کمرے میں داخل ہونے لگا تو وہاں بہت سے لوگوں کا جم غفیر تھا جو ایک وہابی اور عربی کو عدالت میں دیکھنے کے لیے آیا تھا۔

عدالت میں پیش ہوا تو مجھ پر یہ الزامات پڑھ کر سنائے گئے کہ یہ ویزا اور پاسپورٹ کے بغیر افغانستان میں داخل ہوا، یہ تخریب کار گروہ کا ساتھی ہے، یہ بغیر لائسنس کے اسلحہ رکھتا تھا، افغانستان کے امن کو غارت کرنے کے لیے یہ بیرون ملک دشمنوں کے ساتھ ملا ہوا تھا۔

میں نظر اٹھا کر دیکھا تو مجھے علمائے سوء دکھائی دیے جو سرکاری اور درباری تھے، انھوں نے بڑے بڑے پگڑ باندھ رکھے تھے اور ان کے ساتھ جاسوسی کا ادارہ ''خاد'' کی نوجوان لڑکیاں بیٹھی تھیں۔

میں نے ان الزامات کا جواب دیا اور پھر قاضی نے مجھ سے پوچھا تم فلسطین میں جہاد کیوں نہیں کرتے؟ میں نے جواب دیا اس لیے کہ افغانستان میں تو جہاد کے مواقع موجود ہیں جبکہ فلسطین میں کہاں؟ اور جب وہاں دروازے کھل جائیں گے تو وہاں بھی کریں گے، مگر ہم افغانستان میں کیوں انتظار کریں کہ اسے بھی گنوا بیٹھیں، جس طرح کہ تاشقند، بخارا اور سمرقند گنوا بیٹھے۔

پھانسی اور پھر ۲۰ سال قید:

اب قاضی نے فیصلہ سنایا کہ جمہوری افغانستان کے قانون کے مطابق ان جرائم کی سزا پھانسی ہے مگر حکومت افغانستان نے انسانی ہمدردی کی بنا پر اس سزا میں تخفیف کر کے بیس

سال کی سزا سنائی ہے۔

پل چرخی جیل میں:

اب ہمیں پل چرخی جیل میں منتقل کر دیا گیا، یہاں عربی، پاکستانی اور افغان مجاہدین بھی تھے، خلق اور پرچم کے کمیونسٹ بھی تھے، جیل کے داروغوں نے باقی قیدیوں کو ہمارے ساتھ ملنے جلنے سے سختی سے منع کر دیا اور ڈرایا کہ یہ وہابی ہیں جن سے مل کر آدمی کا مذہب خراب ہوجاتا ہے۔

سختیوں کے ساتھ ساتھ اللہ کا یہ احسان بھی تھا کہ ہمیں بعض لوگ ملنے آتے اور کھانے پینے کی مختلف چیزیں لاتے اور کہتے کہ یہ تمھارے فلاں عرب بھائیوں کی طرف سے ہیں۔ہم تعجب کرتے کہ یہ لوگ اور یہ چیزیں ہم تک کیسے پہنچ جاتی ہیں اور وہاں سے پہنچ جاتی ہیں جہاں سے ہمارا وہم وگماں تک نہیں ہوتا۔

جیل میں عیسائیت:

جیل میں بین الاقوامی سرخ صلیب کے نمائندے بھی آتے جو مختلف چیزیں دے کر عیسائیت کی طرف راغب کرتے۔ ایسا ہی ایک وفد آیا۔ اس نے ہم سے ملاقات کرنا چاہی تو ہم نے اسے مسترد کر دیا پھر زبردستی ہماری ملاقات کروائی گئی۔ انھوں نے ہم سے کہا آپ کو رسائل اور دیگر جو بھی ضرورت ہے وہ بتلایے۔ ہم نے کہا ہمیں کسی شے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر اسی تنظیم کی ایک عیسائی عورت جو ایران سے تعلق رکھتی تھی وہ آئی، وہ اپنے حسن کی شوخیاں دکھلاتی، فارسی میں گانے گاتی اور پھر قیدیوں کے ساتھ نازیبا حرکات کرتی۔

پھر انسانی ہمدردی کے نام پر کچھ دوسرے عیسائی صلیبی آئے، وہ بڑے دلکش اور خوبصورت بیگ تقسیم کرتے رہے جن میں بنیان، افغانی چادریں اور دیگر مختلف چیزیں ہوتیں، جن پر صلیب کے نشان بنے ہوتے تھے۔

جیل میں حکومت کی طرف سے نشہ آور چیزیں بھی دی جاتیں اور اس قسم کے ٹیکے بھی

لگائے جاتے کہ جن سے قیدیوں کو فحاشی پر ابھارا جائے اور ان کے اخلاق کو تباہ کیا جائے۔

مجھے سزا دینے والا افسر بھی قیدی بن گیا:

جنرل شاہنواز تنائی نے جب کابل میں نجیب کے خلاف انقلاب برپا کیا اور وہ ناکام ہوگیا تو اس جیل میں میرے ساتھ وہ جنرل بھی قیدی بن گیا کہ جس نے جلال آباد میں مجھے سڑک پر بٹھا کر تعذیب سے دوچار کیا تھا، اب وہ جیل میں ہمارا ساتھی تھا، اس کے ساتھ دو ہزار مزید فوجی آفیسر تھے جو اس جیل میں لائے گئے۔

ابو جہاد کہ جو اب اس جیل خانے سے آزاد ہو چکے ہیں، انھوں نے اپنی داستان سنانے کے بعد مجاہد ساتھیوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ دنیا بھر میں حق کے لیے جو ہمارے ساتھی جیلوں میں موجود ہیں انھیں اپنی دعاؤں میں نہ بھولیں۔

کابل شہر میں:

۸ مئی کو ایک بجے ہم کابل میں دریائے کابل کے کنارے پل خشتی کے سامنے جامع مسجد کابل پہنچے، خطبہ جمعہ ہو رہا تھا، مجاہدین راکٹ لانچروں، کلاشنکوفوں اور دیگر اسلحہ سمیت مسجد کے اندر اور باہر مسلح تعینات تھے۔ صبغت اللہ مجددی صدر افغانستان کے یہاں پہنچنے کے بعد آج امن کا پہلا دن تھا اور مجاہدین کی فتح کے بعد پہلا خطبہ جمعہ تھا۔ خطبہ قاری محمد نبی صاحب فارسی میں دے رہے تھے، صبغت اللہ مجددی، احمد شاہ مسعود اور دیگر بڑے بڑے لیڈر مسجد میں موجود تھے۔ امام صاحب کمیونزم کی بربادی اور جہاد کی برکات بیان کر رہے تھے، اسلامی حکومت کے خدوخال سے لیڈروں کو آگاہ کر رہے تھے اور انھوں نے اپنا خطبہ اللہ کے رسول ﷺ کے اس فرمان پر ختم کیا:

اَلْجِهَادُ مَاضٍ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ

”جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔“

کابل میں پل خشتی کی یہ وہی جامع مسجد ہے جس میں جنرل ضیاء الحق نے فتح کے بعد

شکرانے کے دو نفل کی منت مانی ہوئی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ اس روز جنرل ضیاء الحق، جنرل اختر عبدالرحمن، خاص طور پر شیخ جمیل الرحمن بڑی شدت سے یاد آئے کہ آج سارے افغان لیڈر موجود ہیں مگر ہمارا شیخ دکھائی نہیں دیتا، کنڑ بھی جماعۃ الدعوۃ کو اللہ نے واپس دے دیا مگر شیخ واپس نہیں آسکتے، ہمیں بھی بہر حال اب ان کے پاس جانا ہے۔

مسجد میں مجھے حرکۃ المجاہدین کے رسالہ ''الارشاد'' کے ایڈیٹر عبدالحمید صاحب دکھائی دیے، میں ان سے ملا اور کہا کہ آج کابل پہلی بار آیا ہوں اور ابھی آرہا ہوں، ہمارے قیام کا بندوبست آپ نے کرنا ہے۔ چنانچہ نماز کے بعد وہ ہمیں اپنی جماعت کے سربراہ فضل الرحمن خلیل کے پاس لے گئے اور پھر ہمیں گاڑی میں بٹھا کر شہر کے فائیو سٹار ہوٹل کابل میں لے گئے۔ یہاں اوقاف کے وزیر مولانا ارسلان خان رحمانی سے انھوں نے ہماری ملاقات کرائی اور پھر احمد شاہ مسعود کی شوریٰ نظار کے وزیر مالیات جناب خالد صاحب سے تعارف کروایا۔ اب ہم کابل ہوٹل میں بیٹھے تھے، عبدالحمید صاحب کے ایک مجاہد ساتھی کہنے لگے آپ کے شیخ سمیع اللہ صاحب بھی کابل میں ہیں۔ میں نے کہا یار! آپ ہمیں ان تک پہنچائیں۔ انھوں نے تھوڑی دیر بعد شیخ کا سراغ لگا لیا اور ہمیں بتلایا کہ وہ پلازا ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ چنانچہ یہ ساتھی ہمیں پلازا ہوٹل میں چھوڑ آئے۔ شیخ سمیع اللہ صاحب امیر جماعۃ الدعوۃ یہاں سے واپس پشاور جا چکے تھے جبکہ شیخ جمیل الرحمن رحمہ اللہ کے بھتیجے شیخ ولی اللہ صاحب یہاں موجود تھے۔ اب ہم ہفتہ بھر کابل میں رہے تو شیخ ولی اللہ کے ساتھ اسی ہوٹل میں رہے۔

ہم سارا دن کابل میں گھومتے اور شام کو ہوٹل میں اکٹھے ہوتے تو ہم اپنے تاثرات بیان کرتے جبکہ ولی اللہ صاحب جو افغان لیڈروں کے ساتھ اعلیٰ سطح کی ملاقاتوں میں مصروف رہتے، ہمیں تازہ ترین حالات سے آگاہ کرتے۔

کابل کے حالات:

کابل میں مجاہدین کی مختلف تنظیموں کے کمانڈر ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں میں بھاری

اسلحہ سمیت گشت کر رہے تھے، کابل کے مختلف علاقوں میں مختلف تنظیموں کا کنٹرول تھا، گلم جم ملیشیا بھی تھی جو ہوائی اڈے اور دیگر کئی جگہوں پر موجود تھی مگر مجاہدین کے رعب تلے دبی ہوئی تھی۔ امان اللہ کا محل جو کہ اب احمد شاہ مسعود کا دفتر تھا، اس طرف کو ہم گئے تو کئی جگہ پر شیعہ تنظیم وحدت اسلامی کا کنٹرول تھا۔ ان کے بارے لوگوں نے بتلایا کہ یہ ہزارہ جات کے لوگ ہیں جو کہ چنگیز کی نسل سے ہیں، کمیونسٹوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے، کابل میں موجود تھے۔ چنانچہ کابل میں جب نجیب کے استعفیٰ کے بعد افراتفری کا عالم ہوا تو یہ بھی بعض اہم جگہوں پر کنٹرول حاصل کر کے مجاہد بن بیٹھے ہیں، ان کی لوٹ مار بھی زبان زد عام تھی، شہر سنسان معلوم ہوتا تھا، لوگ خوفزدہ تھے، کئی لوگ کابل سے باہر جا رہے تھے، حکمت یار کے حملے کا دھڑکا تھا، ابھی تین روز قبل انھوں نے سامنے والی پہاڑی سے میزائل داغے تھے اور بیسوں لوگ جان دے بیٹھے تھے۔ گلم جم ملیشیا کی لوٹ مار بھی زبان زد عام تھی حتیٰ کہ ہم پلازہ ہوٹل میں بیٹھے تھے کہ نیچے شور کی آواز آئی، جب ساتھی گئے تو پتا چلا کہ گلم جم والوں نے ایک عورت کا سامان اور عزت لوٹ لی ہے۔

ہمارے ساتھیوں نے ہمیں بھی کہا تھا کہ اس وقت کابل میں گھومنا موت کو دعوت دینے والی بات ہے، کوئی کسی کو پوچھنے والا نہیں، مگر ہم دونوں ساتھی اس کے باوجود دن بھر شہر میں گھومتے اور حالات کا جائزہ لیتے رہتے۔

مہنگائی:

افغان کرنسی کا نام افغانی ہے سو افغانی سکے ساڑھے پانچ روپے پاکستانی کے برابر تھے۔ پاکستانی روپے کو افغانستان میں "کلدار" کہا جاتا ہے، مالٹا یہاں دس روپے کا تھا اور آم ڈیڑھ ہزار افغانی فی کلو تھے۔ ہم دونوں ایک وقت کھانا کھاتے تو ڈیڑھ ہزار افغانی کے لگ بھگ خرچہ آ جاتا۔ ٹیکسی والا بھی تھوڑے سے سفر کے لیے ۸ سو، ہزار اور بارہ صد افغانی سے کم بات نہ کرتا تھا۔ جنگ کی وجہ سے لوگ مہنگائی میں پس چکے تھے، کئی سفید پوش پڑھے لکھے

لوگ اس قدر مجبور تھے کہ ہمیں آ کر کہتے ایک وقت کا کھانا ہی کھلا دیں۔ بازار سے چیزیں نایاب تھیں اور جو موجود تھیں وہ آسمان سے باتیں کرتی تھیں۔

ایک دلچسپ تاریخی جائزہ، بچہ سقہ کون تھا؟:

ایک روز ہم اپنے ہوٹل سے دائیں طرف ایک باغ میں نکل گئے، اس باغ میں امیر عبدالرحمن کی قبر ہے، افغانستان کا یہ وہ بادشاہ ہے جو اپنے آپ کو امیر کہلواتا تھا، اس نے علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کو افغانستان آنے کی دعوت بھی دی تھی۔

چنانچہ ان تینوں کا سفرنامہ ''سیر افغانستان'' کے نام سے ہماری لائبریریوں میں موجود ہے۔ امان اللہ خان اسی امیر عبدالرحمن کا پوتا تھا جو امیر حبیب اللہ کے بعد افغانستان کا بادشاہ بنا تھا۔ امان اللہ خان کے دور میں انگریزوں نے افغانستان میں قدم جمانے کی کوشش کی تو افغانی اٹھ کھڑے ہوئے اور اس وقت کی سپر پاور برطانیہ کو افغانستان سے نکال باہر کیا۔ انگریزوں پر فتح کے حوالے سے کابل میں مینار استقلال موجود ہے اور اسی حوالے سے امان اللہ خان کو غازی کہا جاتا ہے۔

ہوا یوں کہ تلوار کے ساتھ انگریز کو شکست سے دوچار کرنے والا امان اللہ خان انگریز کی تہذیبی یلغار کے سامنے نہ ٹھہر سکا اور اس نے افغانستان کو ترقی یافتہ بنانے کے لیے افغانستان کو انگریزی تہذیب میں رنگنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اس نے سرکاری اہلکاروں کو تعلیم وتربیت کے لیے یورپ بھیجا اور پھر خود بھی اپنی ملکہ ثریا خانم کے ہمراہ یورپ کے دورے پر جا نکلا۔ وہاں ملکہ نے پردہ نہ کیا اور افغان قوم اس پر بپھر گئی کہ یہ ہماری غیرت کا سوال ہے کہ افغانوں کے بادشاہ کی ملکہ عیسائی ملک میں بے پردہ گھومے۔ چنانچہ امان اللہ خان اور آگے بڑھا اور اس نے تمام عورتوں کو بے پردگی کا حکم دے دیا، افغانی برقع کہ جس میں منہ چھپا ہوتا ہے اسے ممنوع قرار دیا اور ایران کا ہلکی برقع کہ جس میں چہرہ کھلا رہتا ہے اسے رائج کرنے کا اعلان کیا۔ مزید برآں اس نے ترکی کے کمال اتاترک کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ''یک

زوجگی، یعنی ایک بیوی ہی کے رکھنے کا حکم دیا کہ جن سرکاری ملازمین نے ایک سے زائد عورتوں سے شادی کر رکھی ہے وہ یا تو زائد بیویوں کو طلاق دے دیں یا ملازمت چھوڑ دیں۔ اسی طرح اس نے قومی پرچم سے کلمہ طیبہ کو بھی نکال دینے کا حکم دیا۔

ادھر بچہ سقہ جو کہ شمالی علاقے کا ایک نوجوان اور فوج میں سپاہی تھا، وہ ڈاکو بن کر اپنا بہت بڑا گروہ اور فوج بنا چکا تھا، لوگ ڈاکوؤں سے تنگ تھے اور دوسرا یہ کہ بادشاہ کے بارے یہ مشہور ہوگیا کہ وہ ملحد، بے دین اور مرتد ہوگیا ہے۔ چنانچہ بے چینی، افراتفری اور ہر سو بغاوت کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر بچہ سقہ نے کابل کے قریب قلعہ مراد پر قبضہ کرلیا۔ تو اب امان اللہ خان اپنے بھائی سردار عنایت اللہ کو بادشاہ بنا کر خود قندھار بھاگ گیا۔ اب بچہ سقہ یہاں ٹھہرنے والا کب تھا، اس نے آگے بڑھ کر کابل پر قبضہ کرلیا اور اس کے مؤذن یعنی اعلان کرنے والے کابل میں یہ اعلان کرتے تھے کہ بچہ سقہ دین کی خدمت کے لیے آیا ہے، وہ دین کی حمایت میں کافر بادشاہ سے لڑتا رہا ہے، اس لیے کسی کو خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، اس نے ظالم کافر سے نجات دلائی ہے، لہٰذا اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

قارئین کرام! اس باغ میں سردار عنایت اللہ کی قبر موجود تھی جس کے کتبے پر بچہ سقہ کے بارے میں لکھا گیا تھا کہ اس ظالم نے سردار عنایت اللہ کا حق بادشاہت غصب کیا۔ بچہ سقہ ڈاکو تھا مگر کابل کے تخت سے اس نے بہر حال ایسے شخص کو بھگایا جو بے دین ہو چکا تھا، جس نے انگریز سے جہاد کیا تو عزت پائی، مغربی تہذیب اپنائی تو ذلت پائی اور بچہ سقہ نے تخت کابل پر براجمان ہوکر جو اعلان کیا وہ کس قدر ایک مسلمان کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے والا ہے، ملاحظہ کیجیے:۔

(۱) امان اللہ خان کے تمام احکامات منسوخ کیے جاتے ہیں۔

(۲) حکومت کی آئندہ اساس شرع محمدی ﷺ پر ہوگی۔

(۳) مکاتب میں تعلیم نسواں بند کی جاتی ہے۔

(۴) بلخی (ایرانی) برقع سختی سے ممنوع قرار دیا جاتا ہے، کوئی عورت دلاق (افغان) برقع کے بغیر گھر سے باہر نہیں آئے گی۔

(۵) تمام مردوں کو شرع محمدی ﷺ کے مطابق چار عورتوں سے نکاح کی اجازت ہے۔

(۶) جن لوگوں نے امان اللہ خان کے دور میں اپنی ایک سے زائد بیویوں کو چھوڑ دیا تھا انھیں اپنی مطلقہ سے دوبارہ نکاح کرنے کی اجازت ہے۔

(۷) مالیہ اس سال معاف ہے۔

(۸) جبری فوجی خدمت موقوف کی جاتی ہے۔

(۹) "بادشاہ" کا جو لقب امان اللہ خان نے اختیار کیا وہ اسلام کے منافی ہے اس لیے افغانستان کا حکمران اپنے نام کے ساتھ "امیر" اور "خادم دین" کا لقب رکھے گا۔

(۱۰) جھنڈا بدستور کلمۂ طیبہ والا ہوگا اور تعطیل جمعہ کو ہوگی۔

صدارتی محل کے حوالے سے موجودہ یادیں:

ایک روز بطور خاص ہم صدارتی محل میں گئے، کچھ دیر تک وہاں گھومتے رہے، یہ وہی صدارتی محل ہے کہ جہاں ظاہر شاہ کا باپ نادر شاہ بادشاہی کیا کرتا تھا۔ نادر شاہ ایک جلا وطن سپہ سالار تھا جس نے بچہ سقہ کی نوماہی حکومت کا تختہ الٹا، اسے قتل کیا اور افغانستان کا بادشاہ بنا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ظاہر شاہ بادشاہ بنا جو روسیوں کا یار، انڈیا کا ساتھی اور پاکستان کا دشمن تھا۔ یہ ۱۷ جولائی ۱۹۷۳ء کا دن تھا جب روس کی شہ پر ظاہر شاہ کے بہنوئی سردار داؤد نے اس کا تختہ الٹ دیا اور وہ روم میں ہی بیٹھا رہ گیا۔

روس اب داؤد سے بھی بڑھ کر روس نواز حکمران چاہتا تھا، چنانچہ اسی صدارتی محل میں ۲۷ اپریل ۱۹۷۸ء کو روس نے افغانستان کی کمیونسٹ پارٹی کے ذریعہ انقلاب برپا کیا، داؤد کو اہل خانہ سمیت قتل کر دیا گیا، عبد القادر ڈوگر وال انقلابی تھا، داؤد کی لاش کو اس محل کے سامنے سڑک پر پھینک دیا گیا، راہ گیروں کو حکم دیا جاتا تھا کہ جو بھی یہاں سے گزرے داؤد

کے منہ پر تھو کے اور عبدالقادر کی تصویر کے گلے میں ہار ڈالے۔ اب ترہ کئی حکمران بن چکا تھا، پھر وہ قتل ہوا اور حفیظ اللہ امین آیا پھر وہ بھی قتل ہوا اور ببرک کارمل صدر بنا، اسے معزول کیا گیا تو نجیب صدر بنا، وہ چند دن قبل تک اسی محل میں تھا، اب وہ اقوام متحدہ کے دفتر میں قید تھا اور یہاں مجاہدین کا بسیرا تھا۔

رہے نام اللہ کا ، جہاد زندہ باد، مجاہدین زندہ باد کے نعرے اب اس شہر میں گونج رہے تھے، روزانہ شام ہوتے ہی خوشی میں مجاہدین کلاشنکوفیں اور ہلکا اسلحہ چلا کر فضا میں تھرتھراہٹ پیدا کرتے ہیں، رنگین گولیاں لکیریں بناتی ہوئی عجیب منظر پیش کرتی ہیں...... یہ افغانستان کے سب شہروں کا اب معمول بن چکا ہے۔

بریگیڈیر عبداللہ سے ملاقات:

صوبہ کنڑ چونکہ جماعۃ الدعوۃ کے کنٹرول میں ہے اس لیے کنڑ سے تعلق رکھنے والے وہ سول اور فوجی آفیسرز اور دوسرے لوگ جو کابل میں کمیونسٹ حکومت میں فرائض سرانجام دیتے تھے، وہ مجاہدین کی حکومت قائم ہونے کے بعد جماعۃ الدعوۃ کے راہنماؤں کے پاس آکر معافی کے خواستگار ہوتے تھے۔ اسی طرح اپنے اپنے علاقوں سے متعلق لوگ وہاں کے کمانڈروں اور جماعتوں کے راہنماؤں سے مل کر وفاداری کا اظہار کر رہے تھے۔

شیخ ولی اللہ نے ان لوگوں کے بارے میں مجھ سے مشورہ طلب کیا تو میں نے کہا کہ حکومت عام معافی کا اعلان کر چکی ہے اور اب یہ لوگ آپ کے پاس نادم ہوکر آرہے ہیں، آپ بھی انہیں معاف کر دیں، شیخ نے کہا میرا بھی یہی خیال ہے۔

چنانچہ ایک روز بریگیڈیر نے جب یہ دیکھا کہ ہم پاکستانی ہیں تو اس نے سوال کیا کہ کیا آپ بھی ہمارے ساتھ لڑتے رہے ہیں؟ میرے مجاہد ساتھی نے اثبات میں جواب دیا تو بریگیڈیر سب پوچھنے لگا، ہم نے کہا آپ لوگوں نے کمیونسٹوں کا ساتھ دیا اور مسلمانوں پر ظلم کیا تھا لہٰذا ہم کیوں نہ لڑتے؟ تب وہ حیرانی سے کہنے لگا کہ پاکستان سے یہاں آکر آپ کو

ہوائی جہازوں کی بے پناہ بمباری اور دیگر مہلک ہتھیاروں سے ڈر نہیں لگتا تھا؟ میرے ساتھی نے کہا بریگیڈیر صاحب! ہم اللہ کے فضل سے سخت گولہ باری میں زیادہ خوش ہوتے تھے کہ اس سے شہادت حاصل ہوگی، جو مومن ومجاہد کا مطلوب ہے جبکہ آپ تو ڈرتے تھے اور کیوں نہ ڈرتے کہ آپ کے دل ایمان سے خالی اور لادینیت سے معمور تھے۔اب میرے مجاہد ساتھی نے سوال کیا کہ کیا جب روسی آپ کے ملک میں مسلمان بھائیوں پر، آپ کے ہم وطنوں پر ظلم کرتے تھے، قتل عام کرتے تھے تو آپ پر اس کا کچھ بھی احساس نہیں ہوتا تھا؟ اس نے نفی میں جواب دیا تو مجاہد ساتھی نے کہا اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کا ضمیر بے غیرت ہوگیا تھا۔ اس پر بریگیڈیر کہنے لگا ہاں! آپ کی بات ٹھیک ہے۔

کابل کے جج کی باتیں:

مولانا عصمت اللہ کنڑ میں درۂ مزار نورگل کے رہنے والے ہیں، کابل میں ان کا خالو غلام نبی رہتا ہے وہ انھیں بتلا رہا تھا کہ جب داؤد برسر اقتدار آیا تو مجھے معزول کر کے تین ماہ تک جیل میں بند رکھا گیا، ہر وقت آنکھوں پر پٹی بندھی رہتی جو صرف بیت الخلاء میں جانے اور کھانا کھانے کے وقت کھولی جاتی پھر مجھے گھر میں نظر بند کردیا گیا۔نجیب کے دور میں سپریم کورٹ کہ جسے ''سترہ محکمہ'' کہا جاتا ہے، اس کے جج کے لیے پیشکش ہوئی، انارنی جنرل کی آفر ہوئی مگر قبول نہیں کی۔جج صاحب جو جامعۃ الازہر مصر کے فارغ ہیں، بتلاتے ہیں کہ کمیونسٹ جب اقتدار میں آئے تو شیعہ، سنی، اہل حدیث سب ان کے ہاں گردن زدنی تھے مگر جب انھوں نے دیکھا کہ مجاہد زور پکڑ رہے ہیں تو پھر انھوں نے حکمت یار کو امریکہ نواز قرار دیا، شیخ جمیل الرحمن اور عبدالرب رسول سیاف کو وہابی قرار دیا اور ریڈیو، ٹیلی ویژن پر یہ پروپیگنڈا کرتے تھے کہ یہ جنگ وہابیوں اور افغان عوام کے درمیان ہے اور یہ جو اپنے آپ کو مجاہد کہلواتے ہیں یہ عربوں سے پیسے لے کر ان کے غلام بن گئے ہیں اور اپنی ملت کے خلاف لڑتے ہیں مگر یہ عرب وہابی ہم پر حکومت نہیں کرسکتے، نہ ہم انھیں کرنے دیں گے اور پھر

ڈراتے ہوئے کہتے کہ اگر یہ وہابی یہاں آ گئے تو تمھیں بھی نہ چھوڑیں گے اور سب افغانوں کو مشرک اور بدعتی قرار دے کر قتل کر دیں گے۔ پھر وہابیوں کی صفات بیان کرتے ہوئے کہتے کہ یہ اپنی تیسری اور پانچویں اور ساتویں سگی بہن سے نکاح جائز سمجھتے ہیں اور ان کے ہاں سوتیلی ماں سے بھی شادی جائز ہے، تو اس طرح سے وہ نفرت پیدا کرتے تھے۔

غزنی کی جانب:

سلطان محمود غزنوی جو مجاہدین کی آئیڈیل شخصیت ہے، اس کے شہر غزنی کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ چنانچہ ہم دس مئی کو صبح چھ بجے کابل سے روانہ ہوئے اور پچھلے پہر چار بجے غزنی پہنچے۔ وہ سفر جو روسیوں کے آنے سے پہلے دو گھنٹے کا ہوا کرتا تھا اب وہ سفر دس گھنٹے کا ہو چکا تھا۔ روسی ٹینکوں نے سڑک کو اس قدر برباد کیا ہے کہ اس سفر نے ہماری ہڈی پسلی ایک کر دی جبکہ عورتوں اور بچوں کا بس میں اس قدر برا حال تھا کہ جو ناقابل بیان ہے۔ راستے میں ایک جگہ بس پنکچر ہو گئی تو افغانی لوگ پہاڑی چارا جو کہ بڑے بڑے پتوں والی سبز بوٹی تھی، اکھاڑ کر کھانے لگے۔ انھوں نے ہمیں بھی دعوت دی، یہ قدرے کڑوے سے پتے تھے جنھیں ہم چکھ کر رک گئے، وہ اس سے اپنی بھوک مٹا رہے تھے۔

اسی طرح افغانستان میں ایک اور انتہائی کھٹی اور بدمزہ سی خود رو سبزی ہے جسے افغان پکا کر اور کچا بھی بہت کھاتے ہیں......اب بتلایئے! ایسی قوم جو پہاڑوں کی بوٹیاں، پتے اور چشموں کے پانی پر گزارہ کر سکتی ہو، ہتھیار اس کا زیور ہوں، پہاڑ ان کے مسکن اور ڈھالیں ہوں، غیرت وحمیت ان کی گھٹی میں ہو، بھلا وہ کسی کی غلام بن سکتی ہے......اور جہاد کی کٹھن زندگی میں یہی چیزیں درکار ہوتی ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جہادی واقعات ملاحظہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ انھوں نے دنیا کو کیسے فتح کیا تھا۔ ایک صحابی بتلاتے ہیں کہ جہاد کے سفروں میں بعض اوقات درختوں کے پتوں پر ہمیں اتنا لمبا عرصہ گزارہ کرنا پڑتا کہ ہمیں قضائے حاجت یوں ہوتی جیسے بکری مینگنیاں کرتی ہے۔

فاتح سومنات کے غزنین میں:

علامہ یاقوت الحموی اپنی کتاب "معجم البلدان" میں لکھتے ہیں کہ غزنی ان شہروں میں شمار ہوتا ہے کہ جس میں علماء کا کوئی شمار نہیں اور اس کے باسی دین دار، اہل شریعت اور سلف صالحین کے طریقے کو لازم پکڑنے والے ہیں۔

سلطان محمود جو ہزار سال قبل ۳۵۷ھ میں پیدا ہوا، اس کی پیدائش پر اس کے باپ شاہ غزنی سبکتگین نے سوورہ میں ہندوؤں کا ایک بڑا بت خانہ مسمار کر کے اللہ کا شکر ادا کیا۔

عراق، ایران، سمرقند و بخارا اور افغانستان کے شمال علاقوں بلخ اور نیچے کابل تک تو اسلام کے پھریرے لہرا ہی رہے تھے جبکہ محمد بن قاسم شیراز سے اٹھ کر سندھ کو ملتان تک اسلام کے نور سے منور کر چکا تھا، اب باقی تو ہندوستان ہی رہ گیا تھا جو کفر اور بت پرستی کا گڑھ تھا۔ چنانچہ سلطان محمود غزنوی کو اپنے باپ کی طرف سے بت توڑنے کی جو گھٹی ملی تھی سلطان بھی اسی راستے پر چلے، بلخ، نیشاپور اور سمرقند و بخارا اور باقی ترکستان سے مسلمان جہاد کی نیت سے غزنی کا رخ کرتے اور سلطان انھیں لے کر ہندوستان میں جہاد کرتا۔

فاتح سومنات کے شہر میں جب ہم پہنچے تو ہوٹل میں کمرا لیا، سامان رکھا، کھانا کھایا اور پھر ہم شہر دیکھنے کو نکل کھڑے ہوئے۔ دریا پار کر کے ہم شہر کی بڑی مسجد میں گئے تو وہاں مجاہدین کے ایک لیڈر مولوی عبدالجبار سے ملاقات ہوگئی، وہ اردو بڑی روانی سے بولتے تھے، ہمیں غزنی میں دیکھ کر بڑے حیران ہوئے، کہنے لگے انقلاب کے دن ہیں، اسلحہ کے بغیر آپ کا یوں گھومنا بڑا خطرناک ہے پھر انھوں نے اپنے ہاں رات گزارنے کی پیشکش کی مگر ہم نے ان کا شکریہ ادا کر کے معذرت کی اور کہا کہ اللہ وارث ہے، کوئی بات نہیں، ہمیں بہر حال افغانستان گھومنا ہے۔

غزنی میں ہم تلاش کرتے رہے کہ سلطان کا کوئی محل ہو تو اسے دیکھیں اور تاریخی عمارتیں ہوں تو ان کا نظارہ کریں مگر غزنی جو کہ آج ہمارے کسی چھوٹے سے قصبے جتنا شہر تھا اور صوبہ

غزنی کا دارالحکومت تھا، اس میں ہمیں ایسی کوئی شے دکھائی نہ دی، ایک پہاڑی ٹیلے پر اس کے باپ سبکتگین کا مزار تھا اور اس سے نیچے ایک مینار تھا، ڈیڑھ دو کلومیٹر کے فاصلے پر پھر ایک مینار تھا، یہ مینار بھی کوئی یادگاری یا زیبائشی نہ تھے بلکہ یہ فوجی اور جہادی مینار تھے کہ جب سلطان جہاد کے لیے ہندوستان کا رخ کرتا تو اسی راستے سے سلطان روانہ ہوتا تھا، ان میناروں سے نقارے بجتے کہ سلطان جہاد کے لیے روانہ ہو رہا ہے اور جب واپس آتا تو پھر بھی نقارے بجتے کہ سلطان ہندوستان میں جہاد کر کے، وہاں اسلام کی شمع روشن کر کے اور کفر کا سر توڑ کر غزنی واپس آ گیا ہے۔

ہم سوچ رہے تھے کہ بادشاہ تو یادگاریں بنواتے ہیں، بڑے بڑے محلات تعمیر کرواتے ہیں باغات بنواتے ہیں۔ شیخوپورہ کے قریب بادشاہ جہانگیر کا ہرن مرگیا تو اس نے وہاں مینار بنا دیا، اس کے بیٹے شاہ جہان کی بیوی ممتاز محل مرگئی تو اس نے اس کی محبت کی یاد میں تاج محل بنا دیا اور وہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ٹھہرا۔ وہ تو خیر بادشاہ تھے آج کل کے صدر اور وزیر اعظم کیا کم ہیں، ایوب نے مینار پاکستان بنا کر کروڑوں روپے ضائع کر دیے تو بھٹو نے لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کا مینار بنا کر بے پناہ پیسا برباد کر دیا اور اب نواز شریف نے باب پاکستان بنا کر غریبوں کے مال کا بیڑہ غرق کر دیا۔ قوم عاد کہ جس پر اللہ نے عذاب بھیج کر اس کا ستیاناس کر دیا، اس کی عادتیں بھی ایسی ہی تھیں، حضرت ہود علیہ السلام انھیں متنبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ ءَايَةً تَعْبَثُونَ ﴿١٢٨﴾ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ﴿١٢٩﴾ (الشعراء: 128، 129)

”کیا تم ہر اونچی جگہ پر ایک فضول یادگار بنا دیتے ہو اور ایسی عمارتیں بناتے ہو گویا تمھیں یہاں ہمیشہ رہنا ہے۔“

غرض سلطان نے ایسی کوئی عمارت نہ بنائی تھی، اسے تو ایک ہی شوق تھا کہ جہاد کرتا

رہے اور اسلام پھیلاتا رہے۔ ایک مہم سے جو مال غنیمت حاصل ہوتا اسے رعایا کی فلاح و بہبود پر خرچ کرتا اور اگلے جہادی لشکر کی تیاری شروع کر دیتا۔ سلطان کے بنائے ہوئے مینار آج بھی افغانیوں اور پاکستانیوں کے لیے مشعل راہ ہیں کہ افغانستان میں جہادی کامیابی کے بعد اب اپنا رخ اس طرف کرو جس طرف تمھارے سلطان نے رخ کیا تھا کہ ہندو کے مظالم سے مظلوم مسلمانوں کے تحفظ کا یہی راستہ ہے۔ سلطان نے ہندوستان پر اس وقت سترہ حملے کیے جب وہاں مسلمان نہ تھے، سب ہندو تھے مگر سلطان نے کفر کا زور توڑا، اسلام کی اشاعت کی اور آنے والے وقت میں مسلمانوں کے اقتدار کی راہ ہموار کی اور ایک ہزار سال تک مسلمان حکومت کرتے رہے۔ مگر آج جب کہ پاکستان سے دوگنے مسلمان وہاں موجود ہیں کس قدر ضروری ہے کہ انڈیا کے خلاف سلطانی اقدام کی یاد تازہ کی جائے۔ سلطان غزنی سے یہاں آیا تھا، ہم تو ہندو کے ہمسائے ہیں، اس کے درمیان اور اس کے اندر بیٹھے ہیں لہذا ہماری ذمہ داری تو اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

سلطان کے بت شکن جہاد پر اک نظر:

سلطان نے نگر کوٹ پر حملہ کیا اور یہاں کے ایک بہت بڑے مندر سے ساٹھ لاکھ اشرفیاں، سات سو من سونا چاندی کے اوزار، دو سو من خالص سونا، دو ہزار من خالص چاندی اور بیس من کے انواع واقسام کے جواہرات لے کر غزنی لوٹا۔

۴۰۲ھ میں سلطان جہاد کے لیے اٹھا اور تھانیسر کا رخ کیا، سب راجوں نے مل کر مقابلہ کیا مگر منہ کی کھائی اور سلطان نے یہاں کے سب بتوں کو توڑنے کے بعد ''جگ سوم'' کو توڑنے کا فیصلہ کیا تو راجوں مہاراجوں نے بڑی منتیں کیں کہ سلطان اس کو نہ توڑے اور جتنا مال چاہتا ہے لے لے۔ سلطان نے جواب دیا کہ جب دنیا سے بت پرستی کے رواج کو ختم کر دینا ہی مقصد ہے تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ تھانیسر جیسے بت پرستی کے مرکز کو نظر انداز کر دیا جائے اور اس کو فتح کرنے کا ارادہ نہ کیا جائے۔

چنانچہ سلطان نے اس بت ''جگ سوم'' کے ٹکڑے کر کے انھیں ایک راستے میں پھینک دیا تا کہ گزرنے والے اسے پاؤں کے نیچے پامال کریں اور اس کی بے بسی کو ملاحظہ کر کے اپنے خالق کی طرف رجوع کریں۔

۴۰۹ھ میں سلطان کشمیر پہنچا تو کشمیر کا راجا سلطان کی قوت دیکھ کر اطاعت بجا لایا اور تحفے تحائف نذر کیے، چونکہ سلطان کا ارادہ قنوج فتح کرنے کا تھا لہذا کشمیر کا راجا بھی سلطان کے ساتھ ہولیا، سلطان نے قنوج فتح کیا اور اس کا راجا جس کا نام ''کورا'' تھا سلطان کے ہاتھ پر مسلمان ہوگیا۔

یہاں سے فارغ ہوکر سلطان نے ''مھترا'' کو فتح کرنے کا پروگرام بنایا، یہ شہر ہندوؤں کے نزدیک خدا کا اوتار کرشن کی جنم بھومی تھا، اس شہر کو فتح کرنے کے بعد سلطان نے غزنی میں جو خط لکھا وہ ملاحظہ کیجیے:

''اس شہر میں ایک ہزار بلند ترین محل ہیں جن میں سے زیادہ تر سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہیں اور مندر تو اتنی تعداد میں ہیں کہ میں انھیں توڑتے توڑتے تھک گیا ہوں لیکن ان کا شمار نہیں کرسکا، اگر کوئی اس قسم کی عمارت بنانا چاہے تو ممکن ہے کہ ایک لاکھ اشرفیاں خرچ کرنے کے بعد دو سو سال کے عرصے میں بہت ہی مشتاق اور ماہر معماروں کے ہاتھوں اس کام کو انجام دیا جاسکے۔ بے شمار مال غنیمت کے علاوہ یہاں سے پانچ سونے کے بت بھی ہاتھ آئے ہیں جن کی آنکھوں میں یاقوت جڑے ہوئے تھے، ان پنج تنی طلائی بتوں کے علاوہ چاندی کے سو بت مزید تھے کہ انھیں ڈھال کر سو اونٹوں پر لادا گیا ہے۔'' (تاریخ فرشتہ)

سلطان سومنات میں:

سلطان کو لوگوں نے بتلایا کہ اب ہندوستان میں سب سے بڑا بت رہ گیا ہے جس کا نام سومنات ہے، ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسان کی روح اس کے بدن سے جدا ہوکر اس بت

کے سامنے حاضر ہوتی ہے اور پھر عقیدۂ تناسخ کے مطابق سومنات اسے نیا جسم عطا کرتا ہے اور یہ کہ سومنات سارے ہندوستان کے بتوں کا بادشاہ ہے اور باقی سب بت جو محمود نے توڑے وہ تو اس کے دربان اور چپڑاسی تھے، سومنات اپنے چپڑاسیوں سے ناراض تھا اس لیے محمود نے ان کو توڑ دیا، سومنات کی طرف رخ کرے گا تو برباد ہو جائے گا۔

سلطان نے یہ سنا تو ۴۱۵ھ میں سومنات کا رخ کر لیا۔ رمضان کے مہینے میں جب سلطان کا لشکر سومنات کے قریب پہنچا تو اہل سومنات قلع کی دیوار پر کھڑے ہو کر چیخ چیخ کر یہ کہہ رہے تھے کہ تم خود نہیں آئے، ہمارا معبود سومنات تم کو یہاں کھینچ کر لایا ہے تاکہ تم سب کو ایک ہی بار تباہ کر دے اور اپنے غلام بتوں کا تم سے بدلہ لے۔ یہ کہنے کے باوجود ہندوؤں کا لشکر سلطان کے لشکر سے خوب لڑا حتیٰ کہ سارا لشکر برباد ہو گیا۔

یہ مندر اتنا بڑا تھا کہ ہندوستان کے سب راجے اس کے لیے جاگیریں وقف کیا کرتے تھے، یہاں ہر وقت دو ہزار برہمن پوجا پاٹ کے لیے حاضر رہتے۔ ان پجاریوں نے مندر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سونے کی ایک زنجیر باندھ رکھی تھی، جس کا وزن دو سو من تھا، اس میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں، پوجا کے وقت اس کو ہلایا جاتا اور لوگ پوجا شروع کر دیتے۔ یہاں پانچ سو گانے بجانے والی خوبصورت عورتیں اور تین سو قوال ملازم تھے۔ ہندوستان کے بیشتر راجے اپنی بیٹیوں کو سومنات کی خدمت کے لیے یہاں بھیجتے، وہ ساری عمر کنواری رہتیں اور مندر کی خدمت کرتیں، انھیں ''دیو داسیاں'' کہا جاتا تھا...... یہ ساری چیزیں اور کنیزیں تو سلطان کے ہاتھ میں مال غنیمت تھا ہی جب کہ سونا چاندی اور جواہرات اس قدر تھے کہ تاریخ فرشتہ کے مطابق اس کا دسواں حصہ بھی آج تک کسی سلطان کے خزانے میں جمع نہ ہوا ہوگا۔

سلطان نے جب سومنات کو توڑا:

جب سلطان مندر کے اس ہال میں داخل ہوا جہاں سومنات بت تھا تو وہ اتنا بڑا تھا کہ

اس کی چھت ۵۶ ستونوں پر قائم تھی، وہاں مصنوعی یا سورج کی روشنی کا کوئی بندوبست نہ تھا، وہاں جو روشنی تھی وہ اعلیٰ درجے کے جواہرات کی شعائیں تھیں جو اس ہال کی قندیلوں میں جڑے ہوئے تھے۔ یہاں سونے چاندی کے چھوٹے چھوٹے بتوں کو روندنے کے بعد سلطان سومنات کے بڑے اور بادشاہ بت کے سامنے جا کھڑا ہوا، یہ پانچ گز یعنی ۱۵ فٹ لمبا تھا، چھ فٹ زمین میں گڑا ہوا تھا اور نو فٹ زمین پر بلند تھا۔

اس دوران شہر کے معزز ہندوؤں نے سلطان تک یہ عرض داشت پیش کی کہ آپ کو جس قدر مال و زر چاہیے ہم حضور کے قدموں میں نچھاور کیے دیتے ہیں مگر سومنات کو کچھ نہ کہیے۔ سلطان کے بعض امراء نے بھی مشورہ دیا کہ سنگ مرمر کے اس بت کو توڑنے کا کیا فائدہ؟ ہم مال لے لیں، مسلمانوں کے کام آئے گا...... سلطان نے یہ سن کر کہا:

''اگر میں نے تمھاری بات مان لی تو دنیا مجھے بت فروش کہے گی جبکہ مجھے یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت میں مجھے محمود بت شکن پکارا جائے۔''

یہ کہتے ہی سلطان کی توحیدی غیرت جوش میں آئی اور سلطان نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گرز سومنات کے دے مارا، اس کا منہ ٹوٹ کر دور جا گرا، پھر سلطان کے حکم پر اس کے دو ٹکڑے کیے گئے تو اس کے پیٹ سے اس قدر اور بیش قیمت ہیرے، جواہرات اور موتی نکلے کہ جو ہندو معززین اور راجوں کی پیش کردہ رقم سے سو گنا زیادہ تھے۔

سلطان محمود کی قبر پر:

اب ہم غزنی کے قبرستان کی طرف چل دیے، یہاں ان ساڑھے چار سو مجاہدین کی قبریں ہیں جنھیں روسیوں کے خلاف مزاحمت کرنے پر ایک ساتھ موت کی نیند سلا دیا گیا تھا۔ اس سے چند سیڑھیاں اوپر چڑھیں تو چھوٹے سے باغیچے میں اس مرد مجاہد کی قبر ہے کہ جس کے دور میں علامہ یاقوت الحموی کی شہادت کے بعد ابن حزم اپنی کتاب ''فتوح الاسلام'' میں لکھتے ہیں کہ سلطان چونکہ اہل حدیث تھے اسی وجہ سے علاقہ کے لوگوں کی اکثریت اہل حدیث

تھی ۔ اسی طرح صاحب ''حقیقۃ الفقہ'' نے مصر سے چھپی ہوئی کتاب ''حیاۃ الحیوان الکبریٰ'' کے حوالے سے سلطان کے دربار کا ایک واقعہ بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سلطان کے دربار میں فقہ حنفی کے مطابق بغیر رفع الیدین کے جلدی جلدی نماز پڑھی گئی اور پھر حدیث کے مطابق رفع الیدین کے ساتھ مکمل سکون اور خشوع کے ساتھ نماز ادا کی گئی تو سلطان نے اس کے بعد رفع الیدین کے ساتھ سنت کے مطابق نماز پڑھنا شروع کر دی۔

قارئین محترم......! یہ تھے وہ مجاہد اور بت شکن موحد، حقیقت سامنے آنے پر فوراً سنت کا دامن تھامنے والا رسول عربی ﷺ کا محبّ، شرک اور بت پرستی کا شمشیر جہاد سے قلع قمع کرنے والا کہ جس کے نام سے آج بھی ہندو کانپ اٹھتا ہے، ہم اس کے مرقد پر کھڑے تھے کہ ہاتھ بے اختیار اس کی مغفرت کے لیے اٹھ گئے۔

کشمیر کی یاد:

میرے مجاہد ساتھی کو کشمیری یاد آ گئے، ظالم ہندو یاد آ گئے، وہ کہنے لگے میں مظفر آباد میں تھا، مقبوضہ کشمیر سے ایک قافلہ آیا، اس قافلے کے ایک مجاہد نے مجھے بتلایا ہم چند ساتھی دہلی کی ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ ایک گھر کے دروازے پر کھڑی بڑھیا نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں بلایا، وہ ہمارے چہرے مہرے سے پہچان گئی تھی کہ ہم مسلمان ہیں اور جب ہم نے بتلایا کہ ہم کشمیری ہیں اور مجاہد بھی ہیں تو وہ رو کر کہنے لگی:

> ''بیٹو! ۱۹۴۷ء میں میں ہندوؤں کے ہاتھ آ گئی، میں مسلمانوں کی بیٹی اب تک اس بدن سے سات ہندو پیدا کر کے اب بوڑھی ہو گئی ہوں، بیٹا! بدلہ لے کر رہنا، جہاد سے پیچھے نہ ہٹنا۔''

قارئین کرام! ایک غزنی ہی نہیں بلکہ افغانستان میں ہم جہاں بھی گئے، جس کو بھی معلوم ہوا کہ یہ پاکستان سے آئے ہیں، اس نے دل اور آنکھیں فرش راہ کر دیں اور اس عزم کا اظہار ضرور کیا کہ جس طرح آپ ہمارے ساتھ افغانستان آئے ہیں، اسی طرح ہم آپ کے

ساتھ کشمیر جائیں گے۔ (ان شاء اللہ) تو ...... دہلی کی اس بوڑھی اماں کی آواز اور اس جیسی ہزاروں مظلوم آوازیں...... وہ کشمیر کے چناروں سے اٹھ رہی ہیں اور وہ کہ جو باقی ہندوستان کے کونوں سے...... ان آوازوں پر اب وہ کان لگے ہوئے ہیں جو قرآن کا یہ مقام سنتے ہیں:

''ان سے لڑو جو اللہ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ ہی اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام جانتے ہیں اور نہ ہی دین حق قبول کرتے ہیں، ان لوگوں سے بھی قتال کرو جنھیں کتاب دی گئی ہے حتیٰ کہ وہ پست ہوکر جزیہ دیں اور ذلیل ہوکر رہیں۔'' (التوبۃ:۲۹)

غور فرمایئے! اس آیت میں واضح طور پر ہندوؤں، بدھ متوں اور یہود ونصاریٰ سے جہاد کا حکم ہے، کوئی دفاعی انداز نہیں بلکہ قرآن اپنے ماننے والوں سے جارحیت اور اقدام چاہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہماری وزارت کا نام وزارت دفاع نہیں بلکہ وزارت حرب یا وزارت جنگ یا وزارت جہاد وقتال ہونا چاہیے۔ سلطان محمود اسی پر عمل کرتا تھا اور ہندوؤں کو باجگزار بنا کر رکھتا تھا۔

اب پھر غزنی کے وطن سے، شہاب الدین غوری کے ملک سے، قطب الدین ایبک کے علاقے سے اور اوپر سمرقند وبخارا کی جانب سے...... بابر کی وادی فرغانہ کی طرف سے پھر قافلے آنے کو ہیں، خیبر سے گزر کر پاکستانی بھائیوں کے ہمرکاب ہوکر کشمیر، دہلی اور سومنات کی طرف مارچ کرنے والے ہیں۔ (ان شاء اللہ)

غزنی سے واپسی:

رات ہوٹل میں بسر کی، صبح سویرے اٹھے، غزنی کا ایک بوڑھا بابا بالائی اور دودھ کے پیالے لے کر بیٹھا تھا، غزنی کی گائے کا مکھن ہمارے پاس موجود تھا، بالائی اور مکھن کے ساتھ تازہ لمبی سی افغانی روٹی کھائی، قہوہ پیا اور واپس کابل کو چل دیے۔ صوبہ غزنی کے بعد صوبہ وردگ آیا اور پھر وہی کابل، کابل کا پلازا ہوٹل اور شیخ ولی اللہ سے غزنی کی باتیں،

سلطان کی یادیں۔

کابل کے ایئر پورٹ کے وی آئی پی روم میں گلم جم کے جرنیلوں کے ساتھ:

غزنی کے سفر نے ہمیں بہت تھکا دیا تھا چنانچہ اب سوچا کہ مزار شریف جانے کے لیے ہوائی جہاز کا پتا کریں۔ چنانچہ ہم دونوں ہم سفر ساتھی کابل ایئر پورٹ پہنچے، پاکستانی ہونے کے ناتے ہر جگہ ہمارے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا گیا، ایئر پورٹ کہ جہاں عام لوگوں کو جانے کی بالکل اجازت نہ تھی، ہمیں ایئر پورٹ کے معاملات کے نگران تو مندان پناہ خان کے پاس لے جایا گیا، تعارف اور ملاقات کے بعد انھوں نے کہا کہ کل صبح مزار شریف ہوئی جہاز جائے گا آپ اس میں تشریف لے جائیں جب کہ رات میرے پاس بسر کریں۔ ہم نے کہا صبح حاضر ہو جائیں گے جبکہ قیام ہمارا ہوٹل میں ہے۔

۱۲ مئی کی صبح ہم ایئر پورٹ پر پہنچے، تو مندان خان نے ہمیں رقعہ دیا اور گلم جم ملیشیا کے ایک افسر کو ہدایت کی کہ یہ ہمارے پاکستانی مجاہد ساتھی ہیں، ان کو ہوائی جہاز میں سوار کر دیجیے۔

آفیسر نے ہمیں ایئر پورٹ کے گیٹ پر پہنچنے کو کہا ہم وہاں پہنچے، سکیورٹی والوں کو پناہ خان کا خط دیا، ایک آدھ منٹ کے بعد وہ واپس آ گئے اور ہمیں اندر چلنے کو کہا..... سکیورٹی والوں نے ہمارے بیگ اٹھا کر ایک جگہ رکھ دیے اور ہمیں کابل ایئر پورٹ کے وی آئی پی روم میں چلنے کو کہا۔ ہم اس میں داخل ہوئے تو وہاں گلم جم ملیشیا کے دو جرنیل موجود تھے انھوں نے ہمیں بڑی عزت افزائی کے ساتھ بٹھایا اور پھر تعارف کے بعد گفتگو شروع کر دی۔

ان دو جرنیلوں میں ایک جنرل عبدالمجید تھا، یہ گلم جم ملیشیا کے سربراہ جنرل عبدالرشید دوستم کا بھائی اور کابل میں گلم جم ملیشیا کو کنٹرول کرنے والا ہے جبکہ جنرل عبدالرشید مزار شریف میں بیٹھا ہے..... جنرل عبدالمجید نے مجھ سے سوال کیا کہ موجودہ جماعتوں میں سے آپ کے خیال میں کون سی اچھی ہے؟ میں نے کہا سیاف ہو یا حکمت یار، ربانی ہو یا مولوی

خالص سب نے آپ کے خلاف جہاد کیا ہے، لہٰذا سب ہی بہتر ہیں۔ پھر کہنے لگا اب جو حکمت یار اور مسعود میں ٹھنی ہوئی ہے، چھڑپیں بھی ہوئیں تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جنگ اسلام کے لیے نہیں اقتدار کے لیے ہے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے الزامی جواب دوں کہ تم کمیونسٹوں کی خلق اور پرچم پارٹیاں ایک دوسرے کی دشمن ہیں اور کس قدر انھوں نے ایک دوسرے کا خون بہایا ہے مگر پھر میں نے یہ جواب اس لیے نہ دیا کہ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ جیسے تم لڑتے ہو ایسے ہی مجاہدین لڑتے ہیں..... جبکہ میں نے اسے کہا کہ قبائلی معاشرے میں چودہ سالہ جہاد کے بعد (اب درمیان میں الجھن کی وجہ سے) مجاہدین کے درمیان جو اختلافات دکھائی دیتے ہیں آپ دیکھیں گے کہ یہ ان شاء اللہ عنقریب ختم ہو جائیں گے۔ پھر اس نے پوچھا کہ آپ کہاں جہاد کرتے رہے ہیں تو میرے مجاہد ساتھی ابوشرحبیل نے بتایا کہ یہیں کابل کے قریب تیزین کے مقام پر ہم کابل کی جانب اسی ایئر پورٹ کی طرف گولے برساتے رہے ہیں جبکہ لوگر کی طرف بھی ہم آپ کے خلاف لڑتے رہے ہیں.....اور اب؟ میں نے کہا اب ان شاء اللہ کشمیر میں کام تیز ہے اور یہ میرے مجاہد ساتھی وہاں مصروف جہاد ہیں۔

اب اس نے میرے مجاہد ساتھی کو سگریٹ پیش کیا تو ابوشرحبیل نے اسے مزاقاً یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ یہ خوراک آپ ہی کے لیے ہے۔

یہ گفتگو جاری تھی کہ ایک شخص اندر داخل ہوا اور کہا کہ جہاز تیار ہے۔ چنانچہ اب ہم جہاز کی طرف چل دیے، جنرل عبدالمجید بھی ہمراہ ہولیا، جہاز کے قریب جا کر اس نے ایک آدمی کو ہدایت کی کہ ان دو مسافروں کا خیال رکھنا۔ ہم الوداعی ملاقات کر کے جہاز میں سوار ہو گئے اور آپس میں گفتگو کرتے تھے کہ یہی وہ ایئر پورٹ ہے جہاں سے اڑ کر جہاز ہم پر بمباری کیا کرتے تھے، آج الحمد للہ جہاد کے راستے سے فتح کا وہ مبارک دن ہے کہ ایک مجاہد کی ہدایت پر ہم وی آئی پی روم میں بیٹھتے ہیں، اس جنرل سے جہاد کی باتیں کرتے ہیں اور سگریٹ کو اس کی خوراک قرار دیتے ہیں کہ جو اس ملیشیا کا جنرل ہے، جو اپنی چنگیزیت میں معروف

ہے۔ہمیں شیخ ولی اللہ نے بتلایا تھا کہ یہ گلم جم ملیشیا والے ازبک ہیں، چنگیز خان کی اولاد سے ہیں، روس میں انھوں نے تربیت پائی ہے اور گلم جم کا مطلب ہے دری کو لپیٹ دینا یعنی یہ اپنے مخالفوں کو دری کی طرح لپیٹ کر اسے بچھا دیتے ہیں......احمد شاہ مسعود کے ساتھ مل کر یہ نجیب کے خاتمے کا سبب بنے ہیں۔اسی وجہ سے یہ کابل میں موجود ہیں مگر اس کے باوجود ہم نے جو مشاہدہ کیا وہ یہ تھا کہ یہ ملیشیا مجاہدین کے سامنے پست اور شکست خوردگی کی حالت میں موجود ہے اور اس پر سب سے بڑی دلیل خود ہماری وی آئی پی روم میں موجودگی اور ان سے گفتگو تھی ۔یہ محض جہاد کے راستے کی عظمت اور عزت تھی جس سے اللہ نے مجاہدین کو سرخرو فرمایا ہے۔

ہوائی ٹرک میں سفر:

یہ جہاز جس میں ہم سوار ہوئے اسے ہوائی ٹرک بلکہ ہوائی گڈ کہنا زیادہ درست ہوگا، اس نے اڑان کے لیے کابل ایئر پورٹ پر ایک چکر لگایا اور پھر ورکشاپ جا کر یہ ہوائی ٹرک کھڑا ہوگیا۔ہمیں بتلایا گیا کہ مزارشریف کا موسم خراب ہے اس لیے انتظار کریں۔اکثر مسافر مجاہدین تھے، راکٹ لانچر، آر۔بی۔جی اور کلاشنکوفیں اٹھائے ہوئے تھے۔بہر حال سب ہی رن وے پر بیٹھ گئے ۔ہم دونوں ساتھی کچھ دیر فرش پر ہی سوکر اٹھے تو دو بجنے کو تھے، صبح کا ناشتہ بھی نہ کیا تھا، چنانچہ بھوک بھی بہت لگ چکی تھی، میرے ساتھی نے ابھی روٹی کا نام لیا تو اللہ نے روٹی بھیج دی، ایک مجاہد ہاتھ میں روٹی پکڑے اور پانی کا برتن تھامے ہماری طرف بڑھنے لگا اور پھر اس نے یہ کھانا ہمارے حوالے کردیا، سب ہی لوگ اس طرح کا کھانا یعنی خمیر اور تین چار انچ موٹی روٹی پانی میں بھگوکر کھا رہے تھے، چنانچہ ہم نے بھی یہ کھانا کھا کر اللہ کا شکر ادا کیا۔

چار بجے اعلان ہوا کہ موسم ٹھیک نہیں ہو رہا لہذا جہاز کل جائے گا۔چنانچہ ہم دوسرے روز پھر ایئر پورٹ پر پہنچ گئے، دوسرے مسافروں کے ہمراہ بیٹھ گئے، اس روز اقوام متحدہ کا

نمائندہ بینن سیوان اور دیگر امریکی عہدیدار بھی ایئر پورٹ پر موجود تھے۔بینن سیوان تو ہمارے قریب ہی گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا اکیلا ہی چہل قدمی کر رہا تھا......سوچتا ہوگا کہ گلم جم ملیشیا کا مستقل کردار افغانستان میں کیسے برقرار رکھا جائے، مجاہدین کو آپس میں جنگ کی بھٹی میں جھونک کر جہاد کے ثمرات کو کیسے برباد کیا جائے......اور یہ بات یونہی نہیں ہے بلکہ افغان مجاہدین کی ایک انتہائی ذمہ دار شخصیت نے کابل میں مجھے یہ بات بتلائی کہ اقوام متحدہ کے امریکی نمائندے اپنی چالبازیوں سے پوری کوششیں کر رہے ہیں کہ مجاہدین آپس میں لڑ پڑیں اور علاقائی اور لسانی تعصبات کی آگ میں کود جائیں......مگر اللہ کے فضل سے ان کی یہ کوششیں برباد ہوتی جارہی ہیں۔

ہم نے سوچا کل والا جہاز شاید یہیں آئے گا مگر اسے تو کل والی جگہ سے ہی اڑنا تھا، چنانچہ اب جو اس کی روانگی کی خبر ہوئی تو ہم اس کی طرف گئے، ہمارے ساتھ چار پانچ اور بھی مسافر لیٹ ہو گئے تھے، بہر حال ہم پہنچے تو جہاز چل پڑا تھا، ہم نے بھاگ کر اسے ہاتھ دیا، پائیلٹ نے لمحہ بھر کے لیے روکا مگر وہاں موجود افسر نے بتلایا کہ ایک اور جہاز بھی جانے والا ہے اس پر چلے جائیں۔ چنانچہ یہ جہاز روانہ ہو گیا جبکہ ہم پچھلے جہاز پر جا بیٹھے، اس جہاز میں کچھ خرابی تھی بہر حال اسے درست کرنے کے بعد آخر کار یہ چل پڑا۔

میں نے جہاز کو ہوائی ٹرک کا نام اس لیے دیا ہے کہ یہ دراصل مال بردار فوجی جہاز ہیں، اب ان میں سفر بھی ہوتا ہے، مال بھی لادا جاتا ہے اور جنگ کے دنوں میں مجاہدین پر ان جہازوں سے بمباری بھی کی جاتی تھی۔ افغانستان اس قدر تباہ حال ہو چکا تھا کہ ان جہازوں میں کوئی ایک بھی صحیح حالت میں نہیں ہے، ہر دفعہ مرمت کر کے روانہ کیا جاتا ہے، جہاز میں جو اردگرد باہر دیکھنے کے لیے شیشے والی کھڑکیاں لگی ہوتی ہیں، مسافر اندر بیٹھے بیٹھے جس کی وجہ سے انھیں اتار دیتے، جہاز چلنے لگتا تو انھیں پھر ساتھ چمٹا دیا جاتا۔ بہر حال یہ جہاز فضا میں اڑنے لگا، پائیلٹ کا معاون پیچھے آیا، اس نے ہم دونوں کو اٹھایا اور فسٹ کلاس وی آئی

پی کیبن میں لے گیا اور وہاں لے جا کر احمد شاہ مسعود کی شوریٰ نظار کے وزیر مالیات کے ساتھ جا بٹھایا۔ یہاں اور بھی کئی اعلیٰ شخصیات موجود تھیں مگر یہ وی آئی پی کیبن بھی ہماری منی بس کی طرح کا تھا کہ جس کی سیٹیں لوہے کی اور وہ بھی ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ہم افغانوں کی اس مہمان نوازی اور پاکستانیوں کے لیے عزت افزائی پر بہر حال بڑے خوش تھے اور اس بات پر بھی کہ ہوائی اڈے کا ایک بڑا آفیسر جو کہ ہمارے ساتھ ہی مزار شریف اپنے گھر جا رہا تھا، کہنے لگا کہ وہاں میرا گھر ہے اور گھر کے ساتھ ہی میرا عالی شان ہوٹل ہے، وہ ہم سے ائیر پورٹ پر بڑے دوستانہ ماحول میں گفتگو کرتا رہا تھا۔ ائیر پورٹ پر ایک تباہ شدہ جہاز کھڑا تھا، میں نے اس سے اس کے بارے پوچھا تو وہ کہنے لگا ہمارے اندر ایک مجاہد تھا، اس نے اپنے آپ کو چھپا رکھا تھا، ایک روز اس نے اس طیارے میں بم رکھ دیا جس سے یہ تباہ ہوگیا، یہ مجاہد قید کرلیا گیا اور ابھی چرخی جیل سے رہا ہوا ہے۔

اب طیارے میں بیٹھا میں سوچ رہا تھا کہ مزار شریف میں اس آفیسر کے ہوٹل میں رہیں گے.....مگر جہاز ۲۵ منٹ ہی اڑا تھا کہ واپس کابل ائیر پورٹ آگیا، پتا چلا کہ اس کے پہیے بند نہیں ہوئے۔ اس کے پہیے تو ٹھیک نہ ہوئے کہ ایک اور جہاز تیار ہوا، اب ہم اس میں سوار ہوگئے، یہ چلنے لگا تو پتہ چلا کہ اس کے دروازے بند نہیں ہوتے، اب انھیں ٹھیک کیا جانے لگا، دو تین گھنٹوں کے بعد جب وہ ٹھیک ہوئے تو اب مزار شریف کا موسم خراب ہوگیا، کچھ دیر موسم کا انتظار ہوا مگر ٹھیک نہ ہوا۔ چنانچہ پائیلٹ نے کہا اب بہتر یہ ہے کہ کل صبح تشریف لے آئیں، ہم مزار شریف جائیں گے۔

یہ سن کر ہم نے فیصلہ کرلیا کہ اب ان گڈوں پر نہیں جائیں گے بلکہ بس ہی بہتر ہے۔ تو جب ہم ائیر پورٹ سے باہر آئے، مجاہدین کی ایک سرکاری گاڑی تھی، اس میں بیٹھ گئے اور انھیں کہا کہ ہم تو پلازا ہوٹل جائیں گے جبکہ آپ نے جہاں تک جانا ہے وہیں کسی مناسب جگہ اتار دیں۔ تب تو وہ کہنے لگے یہ جہادی حکومت کی گاڑی ہے، ہم مجاہدین ہیں آپ بھی مجاہدین

ہیں، جتنا ہمارا حق ہے اتنا ہی تمہارا حق ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کو راستے میں اتار دیں، وہیں تک چھوڑ کر آئیں گے جہاں آپ چاہیں گے۔ چنانچہ ہم ان مجاہد بھائیوں کا شکریہ ادا کر کے مطلوبہ جگہ اترے اور ایک ریڑھی والے سے انگوروں کا پانی پیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ ہم پاکستانی ہیں تو اس نے باوجود اصرار کے ہم سے پیسے نہ لیے، یہ وادی پنج شیر کا رہنے والا تھا۔

مسلمانوں اور مجاہدوں کی یہ وہ باہمی محبت اور الفت ہے جس نے جہاد کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور جسے افغانستان میں ہم نے قدم قدم پر دیکھا ہے، یہ دیکھ کر اور زیادہ پختہ یقین ہوگیا کہ دنیا بھر میں مسلمان جہاد کے نبوی سلسلے کو جاری رکھیں گے تو ساری دنیا کے مسلمان ایک وقت آئے گا کہ عقیدۂ توحید اور جہادی منہج پر ایک ہوجائیں اور یہی وہ حقیقت ہے کہ جس سے آج کفر کانپ رہا ہے۔

روس کے تعاقب میں

شاہراہ سلانگ پر نہر جیحون (دریائے آمو) تک

۱۴ مئی کو صبح چھ بجے ہم **کابل** سے روانہ ہوئے، شہر سے نکلنے کے بعد اب ہم اس سڑک پر محو سفر تھے جسے شاہراہ سالانگ کہا جاتا ہے۔ سارے افغانستان میں **کابل** سے آمو تک یہی وہ واحد سڑک ہے جو صحیح حالت میں ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہی وہ راستہ تھا جس سے روسی فوجی **کابل** میں اسلحہ لاتے تھے اور یہی وہ راستہ ہے جس سے انھیں بھاگ کر واپس جانا تھا۔

دواڑھائی گھنٹے کے سفر کے بعد صوبہ پروان کا دارالحکومت چاریکار کا شہر تھا اور پھر تھوڑی دیر بعد ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر ''جبل السراج'' تھا، یہیں سے دائیں جانب پنج شیر کو سڑک جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ **کابل** سے ''جبل السراج'' تک وادی بڑی کشادہ اور سڑک بالکل ہموار ہے ایسے کہ جیسے **پنجاب** کی کسی سڑک پر سفر ہو رہا ہے جبکہ ''جبل السراج'' کے بعد **تنگ** وادی شروع ہوجاتی ہے۔ اس وادی میں **بل** کھاتے ہوئے دریائے **سالانگ** کے کنارے دریائے **کابل** کی طرح روسی بربادیوں کے بے شمار نشانات ہیں، وہ **نشانات** برباد شدہ ٹینکوں، بکتر بند گاڑیوں، تیل کے ٹینکروں اور فوجی جیپوں کی صورت میں ہیں۔ اس وادی کے وہ بلند و **بالا** خشک پہاڑ کہ جن کی بلندیاں آسمان کو چھو رہی ہیں، ان بلندیوں سے رینگ رینگ کر اور چھپ چھپ کر جب مجاہدین **سالانگ** سڑک پر رواں روسی قافلوں پر حملہ آور ہوتے تھے، انھیں جہنم واصل کرتے تھے تو کریملن میں بیٹھے روسی زعما سر پکڑ کر بیٹھ جاتے تھے

کہ ہمارا کس قوم سے واسطہ پڑا ہے کہ جو مہینوں سفر کرنے کے بعد دشتوں، دریاؤں اور سنگلاخ پہاڑوں کو عبور کرنے کے بعد ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ غرض جبل السراج سے کوہ سالانگ تک وادی کا ایک ایک چپہ روسی بربادیوں اور افغان مجاہدوں کی عظمتوں کا حال سنا رہا تھا کہ روسیوں نے اس خوبصورت وادی میں بیسیوں بستیوں میں ایک بھی سلامت نہیں چھوڑی اور پھر کسی بستی کا ایک گھر بھی تو اصل حالت میں دکھائی نہیں دیتا۔ روسیوں نے یہاں کے مکینوں کو شہید کیا، جو باقی بچے وہ مہاجر ہوئے، ان کا اثاثہ روسیوں کے ہاتھ آیا حتیٰ کہ ان کے مکانوں کی چھتوں کی لکڑیوں کو اکھاڑ کر انھیں اپنے مورچوں میں استعمال کیا۔ مگر یہ سب کچھ کرنے کے بعد روسی اور زیادہ غیر محفوظ ہوگئے، پہلے تو مجاہدین کنارے پر آبادیوں کی وجہ سے جہادی کارروائیاں کرتے ہوئے جو تھوڑا بہت ہچکچاتے تھے کہ جہادی کارروائی کے بعد روسی درندے آبادیوں کے بے گناہ لوگوں پر اپنا غصہ نکالتے تھے مگر اب وہ ہچکچاہٹ بھی ختم ہوچکی تھی، اس لیے کہ نہ کوئی مکان رہا اور نہ کوئی مکین۔ چنانچہ جہاد کے لیے اپنا سب کچھ لٹانے کے بعد مجاہدین نے اب روسیوں پر بے دریغ کارروائیاں کرنا شروع کر دیں اور عظمتوں کی وہ تاریخ رقم کی جس کا مشاہدہ اس سڑک پر سفر کرنے سے ہی ہوتا ہے۔

کوہ سالانگ پر:

اس وادی کا سفر مکمل ہونے کے بعد اب ہمیں کوہ سالانگ پر چڑھنا تھا، چڑھائی سے قبل دریا کے پل پر کلم جم ملیشیا والے چیکنگ کر رہے تھے، گاڑیوں کی ایک لمبی لائن تھی، چنانچہ ہم نیچے اترے اور میں نے کچھ ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کی تصویر بنانا چاہی جو کہ اوندھے منہ دریا میں اور اس کے کنارے گری ہوئی تھیں تاکہ انھیں مجلّہ کے صفحات پر شائع کرکے قارئین کو بتلا سکوں کہ روس افغانستان میں قدم قدم پر اس طرح اوندھے منہ گرا ہے کہ کہیں اس کے دانت ٹوٹے ہوئے ہیں، کہیں ناک کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے اور کہیں جبڑا سلامت نہیں ہے اور اب اسی حالت میں وہ دنیا کے نقشے پر موجود ہے، وہ روس کہ جو کبھی سپر پاور ہوا کرتا تھا۔

مگر جب میں سڑک کے نیچے چلنے لگا تو گلم جم کا ایک فوجی دوڑتا ہوا میری طرف آیا اور اس نے کہا سڑک کے دائیں بائیں ہر طرف بارودی سرنگیں بچھی ہیں اس لیے سڑک سے ہٹ کر چلنا خطرناک ہے۔

میں سوچنے لگا کہ کس قدر بزدل تھے یہ روسی کہ جنھوں نے مختلف قیمتی چیزوں حتیٰ کہ کھلونوں کو بھی بم کی شکل دے کر افغانستان کے میدانوں اور وادیوں میں بکھیر دیا تھا کہ جب معصوم افغان بچہ بھی روسی کھلونا اٹھائے تو اسے دونوں ہاتھوں سے محرومی کا تحفہ ملے، کسی کو آنکھوں سے محرومی کا تحفہ ملے اور کسی کو سارے چہرے کے لہولہان ہوجانے کے بعد سرخ انقلاب کی سرخی کا ہدیہ ملے۔بارودی سرنگوں پر پاؤں پڑنے سے کسی کے پاؤں نہ رہیں، کسی کی ٹانگیں اڑ جائیں اور کوئی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔غرض ان سرنگوں اور کھلونوں کا شکار آج افغانستان میں بے شمار افغان بڑے اور بچے دکھائی دیں گے.....مگر یہ کچھ کرنے کے بعد بھی جب اس قوم سے روسی محفوظ نہ ہوئے تو یہ بڑے شہروں کے گرد سرنگیں بچھا کر خود ہی محصور ہوکر بیٹھ گئے۔

مگر.....کب تک؟ آخر کار اس شاہراہ سالانگ کے ذریعے انھیں واپس بھاگنا ہی پڑا۔

اس سلسلہ ہائے کوہ پر کہ جس کا نام سالانگ ہے اور اسی مناسبت سے اس سڑک کا نام بھی سالانگ ہے، اب ہم اس پر چڑھ رہے تھے، مئی کے مہینے میں بھی یہ پہاڑ برف باری کی زد میں تھے، ہر سو برف ہی برف تھی، ڈیڑھ دو گھنٹوں کے لگ بھگ ان برفانی پہاڑوں پر سفر کیا، روسی چوکیاں اور چھاؤنیاں دیکھیں کہ جن میں سے کئی ابھی تک برف میں دبی ہوئی تھیں.....سوچا تھا کہ شاید ان برفانی چوٹیوں پر، سالانگ کی چوٹیوں پر روسی محفوظ رہے ہوں گے مگر آفرین ہے مجاہدوں پر کہ انھوں نے یہاں بھی ان کافر بھیڑیوں کو ان کے ظلم وستم کا بدلہ خوب چکھایا کہ یہاں بھی روسی بربادیوں کے نشانات کم نہ تھے، یہاں بھی تباہ شدہ گاڑیاں اور ٹینک روس کی بربادی کا حال سنا رہے تھے۔

برف یہاں اس قدر ہوتی ہے کہ اس سے بچاؤ کے لیے اس سلسلہ ہائے کوہ پر بہت سی سرنگیں تعمیر کی گئی ہیں، ایک سرنگ تو اس قدر لمبی تھی کہ بس کو اس میں کم از کم پندرہ منٹ تک چلنا پڑا۔ اس گھپ اندھیری سرنگ میں لائٹوں کا بھی بندوبست کیا گیا تھا۔

پل خمری میں:

کوہ سالانگ سے نیچے اترے تو اب صوبہ بغلان کا ایک قصبہ ''خنجان'' آیا، اس کے بعد ''دوشی'' اور پھر ''پل خمری'' کا شہر آیا، پل خمری کافی بارونق، بڑا اور اچھا شہر ہے، یہاں سے دو بڑے راستے اور سڑکیں جدا ہوتی ہیں، بائیں طرف کا راستہ کہ جو شاہراہ سالانگ ہی کہلاتا ہے، یہ ایبک اور مزار شریف سے ہوکر دریائے آمو پار کر کے ازبکستان سے جا ملتا ہے۔ اس راستے کا پہلا شہر ایبک ہے اور سلطان قطب الدین ایبک کہ جو شہاب الدین غوری کے بعد ہندوستان کا بادشاہ بنا تھا، اس کی قبر آج بھی نیو انارکلی لاہور کے پہلو میں ہے، وہ ایبک کا باسی ہے۔اس کے بعد افغانستان کا کابل کے بعد دوسرا بڑا شہر مزار شریف ہے۔

مزار شریف سے یہ سڑک ''حیرتان'' تک جاتی ہے، اسی مقام پر دریائے آمو پر پل ہے کہ جب روسی فوج افغانستان سے دم دبا کر بھاگی اور منت سماجت کی کہ ہمیں بھاگتے ہوئے مارا نہ جائے یعنی بھاگنے دیا جائے تو روسی فوج کے جرنیل نے اس پل کو پار کرنے کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھا اور توبہ کی کہ اب جو کوئی روسی اس پل کو پار کرے......مگر جہاں روسی جرنیل کھڑا تھا اسی مقام پر اس کے قریب ''ترمذ'' کا قصبہ واقع ہے اور دریائے جیحون پار کرتے ہی یہ قصبہ ماوراء النہر ''دریا کے پار'' کا قصبہ بن جاتا ہے، وہ قصبہ کہ جس کے رہنے والے امام ابوعیسٰی ترمذی تھے، جنھوں نے حدیث کی وہ کتاب لکھی جو صحاح ستہ میں بخاری و مسلم کے بعد تیسرے درجے کی ہے۔

قندوز کی جانب:

کابل سے شمالی علاقوں کی طرف روانگی سے ایک روز قبل نوجوان عالم دین عبدالحلیم صدیقی پلازا ہوٹل میں تشریف لائے، تعارف ہوا تو فرمانے لگے کہ مجلۃ الدعوۃ کے حوالے سے آپ کا غائبانہ تعارف تو تھا ہی، بڑی خوشی کی بات ہے کہ آج ملاقات بھی ہوگئی اور وہ بھی کابل میں۔ مولانا آج کل ''دیر'' میں جماعۃ الدعوۃ کی طرف سے دعوتِ توحید میں مصروف کار ہیں، اصلاً یہ دریائے آمو کے کنارے آباد ایک قصبے ''دشت ارچی'' کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے بتلایا کہ وہاں جماعۃ الدعوۃ کی طرف سے باقاعدہ محاذ اور مجاہدین کی قرارگاہیں ہیں لہٰذا آپ وہاں ضرور جائیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے بھائی مولانا عزیز اللہ اور مولانا عبدالباقی کی طرف ہمیں خط لکھ دیا۔ اب ہم اپنے سلفی بھائیوں سے ملاقات کرنے کے لیے دریائے آمو کے پار دشت ارچی جانے کا پروگرام بنا چکے تھے، اس مقصد کے لیے ہم پل خمری سے قندوز کے لیے روانہ ہوئے۔

پل خمری سے بغلان شہر تک سڑک اچھی حالت میں تھی، یہاں بغلان کا ایک کالج دیکھا جس کی دیوار پر افغانستان کا نقشہ بنا ہوا تھا، اس نقشے میں اردگرد کے ممالک کے نام روس، ایران وغیرہ لکھے گئے تھے مگر پاکستان کی جگہ پختونستان لکھا ہوا تھا، مجاہدین کے ہاتھوں کالج کی عمارت تباہ ہو چکی تھی اور یہ تباہی فقط اینٹوں اور پتھروں سے بنی ہوئی عمارت ہی کی نہیں تھی بلکہ اس قوم پرستانہ نظریے کی بھی تباہی تھی جسے کمیونسٹ ابھارا کرتے تھے اور پاکستان میں ان کا ایجنٹ ولی خان پختونستان کا سٹنٹ کھڑا کیے رکھتا تھا، آج کمیونزم اور قوم پرستی کا بت مجاہدین کے ہاتھوں پاش پاش ہو چکا تھا۔

بغلان کے بعد سڑک خراب تھی، بہر حال چھ گھنٹوں کے سفر کے بعد ہم صوبہ قندوز کے صدر مقام قندوز شہر میں پہنچے، رات ہوٹل میں بسر کی۔ عبدالحکیم ہوٹل والے کو جب معلوم ہوا کہ ہم پاکستانی ہیں تو اس نے ہماری خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کہنے لگا اتفاق سے

ہمارے گھر میں پانچ بہن بھائی، والدین اور بہن بھائیوں کی اولاد موجود تھی کہ گھر میں روسی بم گرا اور میرے خاندان کا کوئی ایک فرد بھی سوائے میرے بچ نہ سکا، میں اس وقت گھر میں موجود نہ تھا، اب میں نے شادی کی ہے اور میری دو بیٹیاں ہیں۔

سرسبز و شاداب جنگل میں:

قندوز سے ہم صبح چھ بجے روانہ ہوئے، تاجکستان کی طرف جانے والی سڑک پر ہماری گاڑی رواں دواں تھی، افغان ہم سفروں سے تعارف کے بعد گفتگو شروع ہوگئی، دوران گفتگو عرب بھائیوں کا تذکرہ چھڑا تو وہابیت زیر بحث آگئی۔ چنانچہ وہ کہنے لگے کہ وہابی تو تیسری، پانچویں اور ساتویں بیٹی سے شادی کرتے ہیں، سوتیلی ماں سے شادی کر لیتے ہیں، یہ سن کر ہم نے کہا بھئی! جو وہابی ہمارے پاکستان میں ہیں وہ تو ایسا نہیں کرتے، نہ ہی عرب وہابی ایسا کرتے ہیں اور کنڑ میں ہم نے شیخ جمیل الرحمن ﷫ کو دیکھا ہے ان کے ساتھی بھی ایسا نہیں کرتے......اب مزاروں کی بات چھڑ گئی تو میرے ساتھی نے اس مسئلے پر بھی انھیں قرآن وحدیث کی روشنی میں تفصیل سے سمجھایا تو وہ کافی حد تک قائل ہو چکے تھے۔

پل خمری سے قندوز تک بھی علاقہ میدانی ہے کہ پہاڑ کم ہی دکھائی دیتے ہیں مگر قندوز سے دریائے آمو کی طرف چلتے ہوئے تو پہاڑ دکھائی ہی نہ دیتے تھے تا حد نگاہ سرسبز و شاداب دشت ہی دشت تھا، بھیڑوں کے بے شمار ریوڑ تھے اور ہزاروں کی تعداد میں گھوڑے تھے جو سرسبز و شاداب دشت میں چر رہے تھے، سڑک بھی اچھی حالت میں تھی اور یہ اس لیے اچھی حالت میں تھی کہ اس دشت میں روسیوں کا قیام تھا اور وہ اسی سڑک سے تاجکستان واپس بھاگے تھے بہر حال گھنٹہ بھر اس دشت میں چلنے کے بعد اچانک ہماری گاڑی سڑک سے اتر کر کچے راستے پر دشت میں چلنے لگی، کچھ دیر بعد گندم کے کھیت تھے، آڑو اور زیتون کے باغات تھے، نالے تھے جو ان کھیتوں میں بہ رہے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹہ بعد ہم صوبہ قندوز کے ضلعی صدر مقام ''امام صاحب'' میں تھے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے مزار پر:

ہمیں معلوم ہوا کہ اس شہر میں حضرت حسین رضی اللہ عنہما کا مزار ہے اور اسی کی مناسبت سے شہر کا نام بھی ''امام صاحب'' ہے۔ چنانچہ ہم تانگے پر بیٹھ کر شہر سے ذرا باہر مزار پر پہنچ گئے، میں نے لوگوں سے پوچھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہما کربلا میں شہید ہوئے اور وہیں ان کی قبر بھی ہے، یہاں ان کا مزار کیسے بن گیا؟ تو جواب ملا کہ وہاں ان کا دھڑ جبکہ یہاں ان کا سر مدفون ہے۔

یاد رہے افغانستان کے بزرگوں کی زیارتیں ہمارے پاکستان کی طرح ٹھاٹھ باٹھ والی نہیں ہیں بلکہ افغان علاقوں کی طرح وہ بھی پسماندہ ہی ہیں، بس ایک قبر پر رنگ برنگی تاکیوں اور چیتھڑوں کے جھنڈے گاڑ دیے، یہی بزرگ کی زیارت ہوتی ہے، کوئی بڑی زیارت ہوئی تو اس پر ایک کچا سا کمرا بنا دیا اور جو بڑی زیارتیں ہیں وہ تو میرے خیال میں دو ہی ہیں، ایک مزار شریف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ والی اور دوسری ان کے بیٹے حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی امام صاحب والی۔ ان میں بھی باپ کی زیارت سب سے بڑی ہے اور بیٹے کی چھوٹی ہے۔

اتفاق دیکھیے کہ روسی افغانستان میں دو راستوں سے آتے ہیں، ایک ازبکستان میں مزار شریف کے راستے اور دوسرے تاجکستان سے امام صاحب کے راستے، مگر دونوں راستوں سے یہ زیارتیں افغان عوام کو بچا نہ سکیں، نہ ان پر ظلم وستم کو روک سکیں اور نہ دہریت کے سیلاب کو تھام سکیں حالانکہ یہ عین ناکوں پر موجود تھیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زیارت کے بارے میں نے لوگوں سے پوچھا کہ آپ کی قبر تو ملک عراق کے شہر نجف میں ہے تو یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مزار کیسے بن گیا؟ تو جس سے بھی پوچھا جواب میں یہ حکایت سننے کو ملی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ کا جسد خاکی ایک اونٹنی پر رکھ دیا گیا اور اسے جنگل میں ہانک دیا گیا کہ جہاں وہ بیٹھے گی وہیں ان کی قبر بنا دی جائے گی، چنانچہ وہ یہاں مزار شریف آ گئی اور یہاں ان کا مزار بن گیا۔ میں نے پوچھا پھر نجف میں کون مدفون ہے؟ تو جواب بہر حال یہی ملتا تھا کہ اصل مدفن یہیں مزار شریف میں ہے۔

بہر حال عملی طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دو مزار اور ان کے لخت جگر، نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے جسم کے دوحصوں کے الگ الگ مزار بنے ہوئے ہیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اس مزار کے بارے میں ماسوائے کچی باتوں کے کوئی ٹھوس تاریخی حقیقت نہیں ہے جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو بات واضح ہے کہ ایک شخص کے دو مزار کیسے ہو سکتے ہیں؟ مگر یہ قبر پرستی کا وہ چلن اور وہ مرض ہے کہ جو آج امت مسلمہ کو دیمک کی طرح کھوکھلا کر چکا ہے اور یہ اسی شرکیہ مرض کا مالیخولیا ہے کہ جس میں مبتلا قوم ایک شخص کے دو دو مزار تعمیر کر رہی ہے اور بعض بزرگوں کے تو دو سے بھی زیادہ ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اب کئی بزرگوں کی پگڑیوں، لاٹھیوں اور دیگر چیزوں کے بھی مزار بننے لگ گئے ہیں۔ ایسا ہی ایک مزار فیصل آباد میں بھی ہے، جسے امام جلوی کہا جاتا ہے مگر اس مزار میں کہ جہاں کروڑوں روپیہ خرچ کر دیا گیا ہے وہاں امام جلوی مدفون نہیں بلکہ جلوی نامی کسی شخص کا عصا اور پگڑی مدفون ہے۔

قارئین کرام! حضرت علی رضی اللہ عنہ داماد رسول تھے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے، شرف صحابیت کے حامل تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تو جزیرۃ العرب میں تمام مورتیوں اور پختہ و بلند قبروں کو ڈھانے والے عظیم موحد اور مجاہد تھے ..... مگر آج شرک میں مبتلا لوگوں نے ان پاکباز ہستیوں کے ناموں پر، ان کے مزاروں پر اپنا شرکیہ کاروبار سجا رکھا ہے۔ مگر اللہ نے عراق کو امریکہ سے برباد کروادیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور پیر بغداد عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے مزارات کو نقصان پہنچا کر لوگوں کو بتلا دیا کہ جنہیں تم پوجتے ہو وہ تو اپنے مزاروں کی حفاظت سے بھی قاصر ہیں، افغانستان میں روسیوں کو روکنے سے قاصر تھے ..... تو پھر اب ان کی پوجا سے باز آجاؤ۔

آگاہ ہو جاؤ کہ وہ نیک لوگ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسی برگزیدہ اور شہید ہستیاں اپنے اللہ کے پاس جنت کی ابدی بہاروں سے لطف اندوز ہو رہی ہیں، اپنے

رب کے ہاں زندہ ہیں مگر تمھاری مدد کرنے سے بے بس اور تمھاری پکاروں سے بے خبر ہیں، تمھارے شرک سے وہ لاعلم اور بری ہیں۔

بہر حال ہم مزار کے اندر گئے، وہاں ایک گدی نشین بیٹھا تھا، زیارت کرنے والے اس کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے تھے، وہ قرآن کی چند آیات پڑھتا پھر لوگ اٹھائے ہوئے ہاتھ چہرے پر پھیرتے، گدی نشین کو پیسے دیتے، قبر کو چھوتے اور واپس چل دیتے ..... یعنی جس طرح کا شرک اپنی آخری حدوں کو پھلانگتے ہوئے برصغیر میں دکھلائی دیتا ہے اس درجے کا شرک افغانستان میں بہر حال مجھے دکھلائی نہیں دیا۔

ننگے بابے کی درگاہ پر:

واپسی پر مجاہدین کا ایک ٹرک کھڑا تھا، ہم اس میں سوار ہو گئے اور واپس شہر میں آ گئے۔ یہاں ایک بابا تھا، اس کے بارے یہ مشہور ہے کہ وہ چالیس سال سے ایک ہی جگہ بیٹھا ہے، بالکل ننگا ہے، نہ وہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے اور نہ ہی حاجت ضروریہ کرتا ہے۔ چنانچہ ٹرک وہیں جا کر کھڑا ہوا اور ہم اسے دیکھنے کے لیے چلے گئے، پندرہ بیس افغانی بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ ہم نے اسے دیکھ کر پشتو، فارسی اور اردو میں یہاں موجود لوگوں کو سمجھانا شروع کر دیا کہ اس کے نہ کھانے پینے کی بات محض فراڈ ہے، یہ قضائے حاجت بھی ضرور کرتا ہے۔ اس قسم کی باتوں کا مقصد تو اس بزرگ کو سوائے مشکل کشا، حاجت روا اور ما فوق الفطرت ہستی ثابت کرنے کے اور کچھ نہیں ہے نا..... تو عیسائیوں نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا اور ان کی ماں حضرت مریم کو مشکل کشا بنا کر پیش کیا تو اللہ نے ان کے دعوؤں کو یہ کہہ کر قرآن میں رد کیا:

﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ (المائدة:٧٥)

”وہ دونوں تو کھانا کھاتے تھے۔“

اور جو کھاتا ہو وہ مشکل کشا اور حاجت روا نہیں ہو سکتا اور یہ بھی کہ جو کھائے گا تو وہ حاجت ضرور یہ بھی کرے گا..... تو جب اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم صدیقہ علیہا السلام کے بارے یہ وضاحتیں کر کے لوگوں کی غلط فہمیاں دور کر رہے ہیں تو یہ بابا بے چارہ کیا شے ہے..... حقیقت یہ ہے کہ یہ تو بے چارہ پاگل ہے، اس کا دماغ ٹھیک نہیں ہے، نہ جانے یہ کون سی مصیبت میں پھنسا ہے، اس کا تو علاج کروانا چاہیے، مگر ہم لوگوں نے اس پاگل کو مشکل کشا سمجھ رکھا ہے..... چنانچہ اس پر دو نوجوانوں نے اعتراضات کیے، ان کے اعتراضات کے بھی جواب دیے گئے۔ لوگ ہمارے اس وعظ و تبلیغ سے بحمد للہ بڑے متاثر تھے، وہابیت کا کوئی الزام ہم پر نہ لگا تھا۔ چنانچہ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ جب حکمت کے ساتھ حق بیان کیا جائے تو وہ بہر حال اپنا اثر چھوڑتا ہے اور مخالفین کا پروپیگنڈا اسی وقت تک مؤثر ہوتا ہے جب تک وہ یک طرفہ رہتا ہے۔ جب قرآن وحدیث کا نور وہاں پہنچتا ہے اور حق اپنے دلائل کے ساتھ میدان میں آتا ہے تو پھر صورتحال کچھ اس طرح سے ہو جاتی ہے:

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ﴿١٨﴾ (الانبیاء: ۱۸)

''بلکہ ہم حق کے ذریعہ باطل پر ایسی ضرب لگاتے ہیں کہ وہ اس کے سر کا بھرکس نکال دیتا ہے جس سے باطل برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔''

قارئین کرام! جب برہنہ بابے نے یہ صورتحال دیکھی تو وہ غضبناک ہو کر افغانی فارسی میں ''برو، برو'' (یہاں سے دفعہ ہو جاؤ) کہنے لگا۔ چنانچہ ہم وہاں سے چل دیے یہ کہہ کر کہ بے چارہ قابل رحم ہے اور پاگل ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو شیطان کا مارا ہوا ہے..... بابا بس یہ الفاظ ہی کہہ سکا، ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکا، اس وقت ہماری عملی کیفیت قرآن کے الفاظ میں کچھ اس طرح تھی:

قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ﴿٧٦﴾ (المائدة: ۷۶)

''کیا تم اللہ کے علاوہ ان کی پوجا کرتے ہو جو تمھارے برے کے مالک ہیں اور نہ بھلے کے۔''

دشت ارچی کی طرف کوچ:

وعظ و تبلیغ کے بعد دوپہر ہو چکی تھی چنانچہ ہوٹل سے دوپہر کا کھانا کھایا اور دشت ارچی جانے کے لیے سواری تلاش کرنے لگے مگر وہ نہ ملی، آخر کار ایک روسی ٹریکٹر اس طرف کو جا رہا تھا چنانچہ ٹرالی پر بیٹھ گئے کہ چلو آدھا سفر اس پر کرتے ہیں باقی پیدل کرلیں گے۔ چنانچہ دو گھنٹے چلنے کے بعد ٹریکٹر نے اپنی راہ لی اور ہم پیدل چلنے لگے۔ ٹرالی میں سوار جب لوگوں کو پتا چلا کہ ہم پاکستانی ہیں تو ہر شخص کی خواہش تھی کہ ہم اس کے مہمان بنیں مگر ہم نے سب سے معذرت کی اور منزل کی طرف چل دیے۔

چودہ پندرہ سال کا ایک افغانی لڑکا جو کہ کراچی میں مزدوری کرتا تھا، دو سال بعد واپس آیا تھا اور اب وہ اپنی ماں کے ہمراہ اپنے وطن جا رہا تھا، ان کے پاس کافی سارا سامان تھا جسے وہ اٹھانے سے قاصر تھے۔ آخر کار یہ سامان ہم دونوں ساتھیوں نے مل کر اٹھایا مگر سفر لمبا تھا، ہم بھی تھک گئے، اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ سامنے سے ایک گدھے والا آ رہا تھا، اسے تین ہزار افغانی پر ہم نے راضی کرلیا، سارا سامان گدھے پر رکھا اور چلنے لگے۔ دو گھنٹے پیدل چلے ہوں گے کہ اس لڑکے نور اللہ کا گاؤں ''ملاخلی'' آ گیا، اس گاؤں کے بائیں جانب دریائے آمو کے کنارے تاجکستان کے پہاڑ اور وہاں مکانوں پر ٹین کی چمکتی چھتیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم اس گاؤں میں نور اللہ کے گھر پہنچ گئے، نماز پڑھی، چائے اور کھانے کا گھر والوں نے بڑا اصرار کیا، رات یہاں گزارنے کی بھی دعوت دی مگر ہم نے معذرت کی اور کہا کہ آپ ہمیں مولانا عزیز اللہ، مولانا عبد الباقی قومندان، عبد الحمید عابدی یا قومندان جلات خان کے پاس پہنچا دیں۔ نور اللہ ہمارے ہمراہ ہولیا۔ اس کے دادا کو ہم نے الوداعی سلام کیا تو یہ تاجکستانی بزرگ جس کی عمر سو سال کے قریب ہوگی اور آج سے ستر سال قبل یہ

تاجکستان سے ہجرت کر کے اس وقت افغانستان آ گیا جب وہاں روسی انقلاب آیا، مگر ساٹھ سال بعد دہریت کا علمبردار یہ ذلیل (روسی) انقلاب بوڑھے تاجکستانی کا پیچھا کرتے ہوئے افغانستان میں بھی آیا تھا اور آج اس بوڑھے کی زندگی میں ہی یہ انقلاب **ذلیل** وخوار ہو کر افغانستان سے ہی رخصت نہیں ہوا بلکہ تاجکستان سے بھی دم دبا کر بھاگتے ہوئے اپنی موت آپ مر گیا ہے۔اس بوڑھے بزرگ کو جب معلوم ہوا کہ ہم پاکستانی ہیں اور بغیر کھائے پیے جا رہے ہیں تو اس کی پریشانی دیدنی تھی کہ پاکستانی مسلمان ......اس دشت میں......ہمارے گھر......اور پھر رات گزارے بغیر......کھانا کھائے بغیر......یقیناً اس پریشانی کا ادراک وہی کرسکتا ہے جسے افغانوں اور عربوں کی مہمان نوازی سے واسطہ پڑا ہوا......ہم میدانی لوگ کیا جانیں کہ مہمان نوازی کیا ہوتی ہے۔(الا ماشاء اللہ)

بہر حال ہم یہاں سے نکلے تو گاؤں میں بچوں کو معلوم ہوا کہ نوراللہ آیا ہے تو وہ دوڑتے آئے۔نوجوان اپنے یار کو ملنے کے لیے چلے آئے، حتیٰ کہ گاؤں کی عورتوں نے بھی نوراللہ سے شفقت ومودت کا اظہار کیا۔مجھے یہ منظر بڑا اچھا لگ رہا تھا، نوراللہ کوئی چودھری کا بیٹا نہ تھا جس کا یوں استقبال ہو رہا تھا بلکہ یہاں وہی محبت بھرا دیہاتی ماحول تھا جو کبھی نصف صدی قبل ہمارے پاکستان کے دیہات میں بھی ہوا کرتا تھا......گاؤں کا قومندان کہ اتفاق سے اس کا نام بھی نوراللہ تھا، اسے جب معلوم ہوا کہ ہم پاکستانی ہیں، ان کے مجاہد ساتھی ہیں تو انھوں نے بھی رات گزارنے کو بڑا اصرار کیا مگر ہم نہ مانے تو انھوں نے کلاشن اٹھائی، کلاشن بردار محافظ ہمراہ لیے، ہمارے بیگ اٹھائے اور ہمیں جلات خان کے ڈیرے پر پہنچانے کے لیے چل پڑے۔

روس افغانستان سے کیوں بھاگا؟ایک سبب:

راستے میں باتیں چلتی رہیں، قومندان نوراللہ نے بتلایا کہ جب روسی فوجوں کا ظلم وستم حد سے بڑھ گیا تو مجاہدین نے فیصلہ کیا کہ روس کے اندر کارروائیاں کی جائیں۔ چنانچہ ہم کئی

دفعہ تاجکستان کے اندر گئے اور اس وقت کے روس میں جا کر جہاد کیا۔ نوراللہ کی یہ بات سن کر مجھے افغان جہاد پر جنرل ضیاء الحق اور جنرل اختر عبدالرحمن کی میٹنگ یاد آ گئی۔ ''فاتح'' کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''بہت پہلے روسیوں نے ابھی جنگ کی حرارت محسوس کرنا شروع نہیں کی تھی، افغان سیل کے ایک اجلاس میں جنرل اختر نے کہا تھا کہ کابل میں معمول کی زندگی گزارنے والے روسی جرنیل کو جب تک ہراساں اور خوف زدہ نہیں کیا جائے گا وہ پسپائی پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ اب ایک اجلاس میں انھوں نے یہ کہا کہ اگر سرحد پار سے روسی افغانستان میں داخل ہو سکتے ہیں تو افغان مجاہدین کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ دریائے آمو کے اس طرف مختصر سی کارروائی کر ڈالیں، اس اجلاس میں دوسروں کے علاوہ وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب خان بھی موجود تھے، چیختے ہوئے انھوں نے کہا اس طرح تو آپ لوگ پاکستان کو برباد کر ڈالیں گے...... یہ الگ بات ہے کہ جب ایسا ہوا تو گورباچوف نے اپنے ملک میں افغانستان سے واپسی کے لیے اس کارروائی کو ایک دلیل کے طور پر استعمال کیا۔''

قارئین کرام! روسی افغانستان سے بھاگ کھڑے ہوئے اور اس کے لیے جہاں دیگر بہت سے اسباب تھے وہاں ایک بڑا سبب روس کے اندر جہادی کارروائی تھی کہ جس سے بوکھلا کر گورباچوف نے واپسی کا اعلان کر دیا اور ہمارے لیے خوشی کی بات تو یہ تھی کہ آج ہم ان قومندانوں اور مجاہدوں سے جہاد کی وہ ایمان افروز باتیں سن رہے تھے، ان کارروائیوں کو ملاحظہ کر رہے تھے کہ جو روس کے پیٹ میں گھس گئیں...... ان کارروائیوں نے تو تبوک کی وہ یادیں تازہ کر دیں کہ جب اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے کی سپر پاور سلطنت روم کی فوجیں مسلمانوں پر چڑھائی کرنے کے لیے مدینے کا رخ کرنے لگیں تو اللہ کے رسول ﷺ نے اس سپر پاور کو سبق سکھانے کے لیے صحابہ رضی اللہ عنہم کا لشکر اس وقت تیار کیا جب سخت گرمیوں کا موسم

تھا اور ادھر مدینے کے پھل اور فصل پک کر تیار ہو چکی تھی، اقتصادی حالت بھی دگرگوں تھی، مدینے میں منافقین بھی موجود تھے۔ یعنی حالت یہ تھی کہ اللہ کے رسول ﷺ سپر پاور سے مقابلہ کے لیے مدینے سے باہر نکل کر اقدام نہ کریں تو تب بھی رومیوں کے حملہ آور ہونے کا خطرہ اور اگر مدینے سے باہر نکلیں تو منافقوں کی شرارتوں کا خطرہ۔ غرض مدینے کی ریاست ہر طرف سے خطرے ہی خطرے میں تھی...... مگر اللہ کے رسول ﷺ نے ان عسرتوں اور تنگیوں کے باوجود اسلامی فوج کو تیار کیا اور تقریباً بارہ سو کلومیٹر کا سفر کرنے کے بعد تبوک کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ اب رومیوں کو معلوم ہوا کہ محمد ﷺ تو تیاری کر کے اپنے لشکر سمیت ہم سے مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے گھر کے دروازے پر پہنچا چاہتے ہیں، نہ معلوم وہ کس قدر عسکری قوت کے مالک ہیں کہ جو اتنی دور تک ہم سے مقابلہ کے لیے آئے ہیں۔ چنانچہ اس وقت کی سپر پاور اس رعب تلے دب کر پسپا ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ اللہ کے رسول ﷺ کے بعد صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما کے دور میں اس کا نام ونشان مٹ گیا۔

عساکر صحابہ کے عظیم سالار، جرنیل اعظم، امام المجاہدین، امام الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی دشمنوں پر دفاع کی بجائے اقدام کرنے کی اس سنت کا احیاء آج میں افغان کمانڈر سے سن رہا تھا، ایک نظر کلاشن بردار مجاہدوں کو دیکھتا اور دوسری نظر سامنے دکھائی دیتا دریائے آمو سے پار تاجکستان کا پہاڑ دیکھتا اور پھولے نہ ساتا تھا کہ اللہ نے اپنے نبی ﷺ کے طریقے پر چلنے کی برکت سے آج مسلمانوں کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ (الحمدللہ)

قومندان جلات خان کے مہمان:

ڈیڑھ گھنٹہ چلنے کے بعد اب جلات خان کا گھر سامنے تھا، ان کا بھائی اور دیگر مجاہد ساتھی کہیں جا رہے تھے، جب انھیں نوراللہ نے بتلایا کہ یہ تمھارے پاکستانی مہمان ہیں تو وہ اپنے سارے پروگرام چھوڑ کر ہمیں گھر لے آئے، ابھی بیٹھے ہی تھے کہ کھانا آ گیا، قہوہ پیش ہوا اور پھر وہی اپنا من پسند عنوان اور موضوع جہاد کی باتیں...... قتال کی یادیں۔

دشت ارچی کا یہ سارا علاقہ میدانی ہے، قریب قریب کوئی پہاڑ نہیں، گندم کے کھیت، درخت اور خود رو رنگ برنگے پھول کہ یہاں اب بہار کا موسم آیا ہے......اور بہار کے موسم میں ہی ۱۴سال بعد فتح کی بہار بھی دیکھنے کو ملی ہے اور ہم اس بہار میں گلستان جہاد کے پھول مجلۃ الدعوۃ کے قارئین کے لیے چن رہے تھے۔

اس گلستان جہاد وقتال کے ایک پھول گل آغا نے کہا کہ سرحد پر ہونے کی وجہ سے ہمارے یہاں روسیوں کی بمباری بڑی شدید ہوتی تھی پھر علاقہ بھی میدانی اور اس پر مستزاد یہ کہ پاکستان سے یہاں خوراک، اسلحہ اور ادویہ وغیرہ کے لیے ایک ایک ماہ کی مسافت درکار ہوتی تھی کہ جس کی دشوارگزاری ناقابل بیان ہے۔ چنانچہ ہم میں سے جب کوئی تھوڑا بہت زخمی ہوتا تو اس کا خود ہی علاج کر لیتے اور جب کوئی زیادہ زخمی ہوجاتا تو ہم اس کا سر مونڈھ دیتے اور بزرگوں کے ہاتھ روسی ہسپتال میں پہنچا دیتے۔ وہ بزرگ روسیوں سے کہتے کہ یہ مجاہد نہیں ہے، گھر میں ہی بمباری سے زخمی ہوگیا ہے۔ چنانچہ جب یہ زخمی مجاہد اور غازی صحیح ہوجاتا تو دوبارہ جہاد شروع کر دیتا......مگر انھیں اگر پتا چل جاتا کہ یہ تو مجاہد ہے تو اسے زہر کا ٹیکہ لگا کر شہید کر دیتے۔

جہاد افغانستان میں عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا بھی ایک کردار ہے، وہ خلقی کمیونسٹوں سے اشیائے ضرورت خریدتے اور پھر مجاہد ان سے خرید لیتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ کوئی بوڑھا بھیس بدل کر کمیونسٹوں کے اندر گھومتا پھرتا اور پھر اچانک موقع پا کر فائر کرتا اور بھاگ کھڑا ہوتا۔ اس سے کمیونسٹ پریشان ہوجاتے کہ یہ ہمارے اندر سے کون تھا جو یوں کارروائی کر کے بھاگ اٹھا۔

گدھے پر سفر:

رات کھانا کھانے کے بعد دیر تک گفتگو کرتے رہے، صبح بیدار ہوئے اور قومندان عبدالحمید عابدی کی قرارگاہ کی طرف چل دیے۔ طاہر خان گدھا اور کلاشنکوف لے کر ہمارے

ہمراہ ہولیا۔ ہم دونوں باری باری گدھے پر بیٹھتے رہے، اڑھائی تین گھنٹے یوں سفر کرنے کے بعد طاہر خان ایک ڈیرے پر رک گیا اور کہنے لگا کہ یہاں اب ناشتہ کرلیں پھر آگے چلیں گے۔ چنانچہ اس نے ڈیرے کے مالک آدم خان کو آواز دی، آدم خان باہر آیا، طاہر خان نے اسے بتلایا کہ یہ ہمارے پاکستانی مجاہد ہیں، یہ سنتے ہی آدم خان نے اپنے مزارع کو تالین لانے کا کہا اور وہ اندر سے تالین اٹھالایا۔ رات بھر بارش ہوتی رہی تھی، صبح بھی ہلکی ہلکی پھوار تھی، اب ختم ہو چکی تھی، باہر کا موسم بڑا خوشگوار تھا، آدم خان نے یہیں ایک بڑے درخت کے نیچے تالین بچھا دیا۔ ہم نے کہا کہ کیچڑ پر تالین بچھانے کی کیا ضرورت تھی؟ تو آدم خان کہنے لگا آپ جیسے مہمان اور یہ تالین کیا چیز ہے..... بہرحال تکیے لگ گئے اور ہم تالین پر بیٹھ گئے۔

فوراً گائے کا دودھ آ گیا، قہوہ تو تھا ہی افغانی روٹیاں بھی دستر خوان پر سج گئیں۔ چنانچہ ناشتہ شروع ہو گیا، چار سالہ معصوم سا خوبصورت بچہ قریب آ کر بیٹھ گیا، میں نے آدم خان سے پوچھا یہ آپ کا بیٹا ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا پھر وضاحت کرنے لگا کہ یہ محمد خان کا بیٹا ہے جو روسیوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گیا، اس کے بعد میں نے شہید کی بیوہ سے شادی کرلی، یہ میری دوسری بیوی ہے جبکہ پہلی سے بھی میری اولاد موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ افغان قوم بڑی غیور قوم ہے، ایسی قوم کہ جس کے سترہ لاکھ افراد جنگ کی نذر ہو گئے جبکہ زخمیوں اور معذروں کا کوئی شمار نہیں، مگر غور کیجیے کہ افغان بیواؤں کا اس قوم نے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہونے دیا اور وہ مسئلہ اسی لیے پیدا نہیں ہوا کہ افغانوں نے دو دو، تین تین اور چار چار شادیاں کرلیں۔ تعدد ازدواج کے قرآنی حکم کی حکمت یہاں بخوبی سمجھ آتی ہے، وگرنہ جنگ عظیم کے بعد سارا یورپ ایسی اخلاقی بے راہ روی اور بد کرداری کا شکار ہوا کہ جسے دیکھ کر شیطان آج بھی شرما اٹھتا ہے۔ چنانچہ افغان معاشرے کا یہ اسلامی پہلو بھی عربوں کی طرح ایسا تابناک ہے کہ جسے دیکھ کر دل بے اختیار بول اٹھتا ہے کہ زندگی کا وہ کون سا شعبہ ہے کہ جہاں ہمارے رب کی راہ نمائی موجود نہیں ہے۔

محمد خان کے اس یتیم بچے کا نام صمد خان تھا، دنیا ومافیھا سے بے نیاز ہوکر ''کوفیہ'' چلا رہا تھا، دس بارہ سال کا جب ہوگا تو کلاشنکوف تھام لے گا، اسے جب معلوم ہوگا کہ میرے باپ کو روسیوں نے شہید کیا تو اس کا دل آخر ماسکو تک روسیوں کا پیچھا کرنے کو کیوں نہ چاہے گا۔ میرے ہم سفر ساتھی کو بادام بڑے پسند تھے، چنانچہ انھوں نے جیکٹ کی جیب سے بادام نکالے اور صمد خان کو دے دیے، اس کی جیب میں افغانی کرنسی ڈالی، جی بھر کر اسے پیار کیا کہ یہ ایک شہید کا بیٹا تھا۔

ایک سوال کے جواب میں آدم خان نے بتلایا کہ اس کے ماں باپ اور ایک بھائی بھی اللہ کے راستے میں شہید ہوئے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ افغان قوم جو جہاد میں کود پڑی اس کے ملک افغانستان میں شاید ہی ایسا کوئی گھر ہو کہ جس میں ایک بھی شہید نہ ہوا ہو یعنی ایک نہ ایک تو بہر صورت ہے جبکہ دو دو، تین تین اور چار پانچ تک تو عام ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جس گھرانے کا ایک فرد بھی شہید نہیں ہوا اس گھر کو افغانستان میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔

ناشتہ کر کے چلے تو ڈیڑھ گھنٹہ بعد ہم قومندان صاحب کی قرارگاہ پر تھے، جلات خان جو اپنے گھر میں موجود نہ تھے، وہ بھی یہیں تھے۔ چنانچہ دونوں قومندانوں سے ملاقات ہوگئی، کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد ہم نے مولانا عبدالباقی صاحب کی قرارگاہ پر جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو ایک کلاشن بردار مجاہد کو ہمارے ہمراہ کر دیا گیا اور گھنٹہ بھر سفر کرنے کے بعد ہم سلفیوں کی قرارگاہ پر تھے۔

سلفی مجاہد مولانا عزیز اللہ شہید کی قرارگاہ پر:

روسی سرحد پر واقع دشت ارچی جو کہ دریائے آمو کے کنارے صوبہ قندوز کا ضلع بھی ہے، ہم اس کی بستی باجوڑی میں پہنچے، یہی مولوی عزیز اللہ کا گاؤں ہے، اس گاؤں کے جس گھر میں ہم پہنچے یہ گھر تو مولوی عزیز اللہ ہی کا ہے مگر مجاہدین کی قرارگاہ ہے۔ کابل سے ہمیں

مولوی عبدالحکیم پر اور مولوی عزیز اللہ نے اپنے بھائی کے نام خط دیا تھا مگر یہاں آ کر معلوم ہوا کہ وہ تو عرصہ دو سال سے شہید ہو چکے ہیں مگر دوریاں اس قدر تھیں کہ ہنوز مولوی عزیز اللہ کی شہادت سے اس کا بھائی بھی بے خبر تھا اور باقی احباب بھی۔

ہم قرارگاہ میں پہنچے تو مولانا عبدالباقی جو کہ جماعۃ الدعوۃ الی القرآن والسنۃ کی طرف سے مجاہدین کی قرارگاہ کے قومندان تھے، انھوں نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ یہ مولانا عزیز اللہ کے ماموں ہیں اور اب اپنے بھانجے کے جانشین ہیں۔ جب ہم پہنچے تو دوپہر کا دسترخوان بچھ چکا تھا، ہم بھی شامل ہو گئے اور ساتھ ہی گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مولوی عزیز اللہ جو کہ جمیل الرحمٰن رحمہ اللہ کی جماعت سے وابستہ تھے، انھوں نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے اس علاقے میں دعوت وجہاد کا کام شروع کیا اور اس قدر تیزی، لگن اور محنت سے کام شروع کیا کہ جہاد میں قرارگاہ اور جبہہ بنایا، دعوت کا کام کر کے لوگوں کے عقائد کو سنوارا اور پھر انھیں مجاہد بنایا۔ ان کا یہ کام کمیونسٹوں کو مطلق نہ بھایا۔ چنانچہ ان کے قتل کے پروگرام بننے لگے حتیٰ کہ افغان جاسوس ادارے خاد نے اس شخص کے لیے ۶۰ لاکھ افغانی کرنسی کا انعام مقرر کیا جو مولوی صاحب کو قتل کرے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اس علاقے کا ایک شخص صوفی اسماعیل جو کہ مولوی صاحب کی دعوت کا دشمن تھا، وہ اپنے مقصد کے لیے کمیونسٹ بن گیا اور دو سال قبل جبکہ مولوی صاحب عید الفطر کی نماز پڑھا کر واپس جا رہے تھے، کلاشنکوف کے برسٹوں سے ان پر حملہ کر دیا گیا۔ چنانچہ مولوی صاحب، ان کے چار ساتھی قومندان مومن خان، ہارون خان، یعقوب خان اور بدخشاں کے ایک سلفی قاری شہید ہو گئے۔

مولوی صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالحمید نے بتلایا کہ جب بھائی جان شہید ہوئے تو احمد شاہ مسعود ان دنوں اسی علاقے میں کہیں موجود تھے، انھوں نے مولوی صاحب کی شہادت پر کہا تھا کہ جب حالات سازگار ہوئے تو مولوی صاحب اور ان کے ساتھیوں کا

بدلہ لوں گا۔

مولوی صاحب کے گاؤں باجوڑی میں سے جب ہم گزرے تو باقی دیہات کی طرح اس کا بھی کوئی ایک گھر بھی سلامت نہ تھا، چھتوں کے بغیر دیواریں موجود تھیں، مکین غائب تھے۔ مولوی صاحب کا گھر مجاہدین کی قرارگاہ ہے، جس کا نام ''النجم'' ہے۔ دعوت وتوحید کا یہ ستارہ آج بھی جگمگا رہا ہے، دشمن اپنے مقاصد میں ناکام ہوئے ہیں۔ مولوی صاحب اور ان کے ساتھیوں کی شہادت اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، وہ تو سرخرو ہوئے (ان شاء اللہ) جبکہ دنیا میں بھی ان کا لگایا ہوا پودا بارآور ہو رہا ہے۔ مولوی صاحب کی مسجد بھی دیکھی جہاں وہ خطبہ جمعہ دیا کرتے تھے، یہ مسجد آج بھی آباد ہے اس کی داہنی دیوار کے ساتھ وہ مورچہ آج بھی موجود ہے جہاں مولوی عزیز اللہ کمیونسٹوں کے خلاف مورچہ زن ہوا کرتا تھا۔ مسجد اور مورچے کا یہ حسین امتزاج دل کو بڑا ہی بھا رہا تھا، بہار کا موسم تھا، ہر طرف قدرتی پھول ہی پھول تھے، مسجد کے سامنے شہداء کا قبرستان تھا، یہیں مولوی صاحب کی قبر تھی، مجاہدین نے ہماری راہ نمائی کی، وہاں جا کر فاتحہ پڑھی، کیونکہ خودرو پھول اس قدر تھے کہ یہاں کوئی قبرستان اور قبر کا وجود تو معلوم ہی نہ ہوتا تھا۔

مولوی صاحب جب شہید ہوئے تو اڑھائی سو آدمی جماعۃ الدعوۃ سے منسلک ہو چکے تھے۔ جب ہم قرارگاہ میں گئے تو دسترخوان پر بیس کے قریب مجاہد موجود تھے۔ مولانا عبدالباقی نے ہمیں شیخ ولی اللہ کے لیے رقعہ دیا اور پھر ہم نے واپس جانے کی اجازت چاہی۔ چنانچہ بڑے اصرار کے ساتھ رات گزارے بغیر جب ہم رخصت ہوئے تو ہمیں روسی ٹریکٹر اور ٹرالی دی گئی کہ اس دشت میں سفر کے لیے یہ سواری لینڈ کروزر سے کم نہیں ...... تین سلفی مجاہد ہمارے ہمراہ تھے، پانچ گھنٹے کے بعد ہم ''امام صاحب'' واپس پہنچ چکے تھے۔ راستے میں ایک قرارگاہ پر سلفی کمانڈر نظام الدین سے ملاقات کی، خواجہ غار کا سلفی نوجوان ذبیح اللہ بھی تپاک سے ملا۔

قندوز کے سب سے بڑے کمانڈر سے ملاقات:

صبح اٹھے تو بائیس ہزار افغانی کرنسی پر کرائے کی جیپ پکڑی اور کمانڈر صاحب کی ملاقات کو روانہ ہوئے۔ ڈرائیور نے سیدھے راستے کے بجائے مختصر راستہ اپنایا اور صحرا نما دشت میں جیپ دوڑاتے ہوئے کوئی ایک گھنٹے بعد مین روڈ پر پہنچا۔ یہاں ہم ایک بستی میں اس صوبے کے سب سے بڑے کمانڈر مولوی عبد اللطیف سے ملاقات کرنے ان کی قرارگاہ میں گئے۔ قرارگاہ کے باہر جیپیں، ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں کھڑی تھیں۔ قرارگاہ سے باہر کلاشن بردار مجاہدین کا گروپ کھڑا تھا، ہم نے انھیں اپنا تعارف کروایا اور کمانڈر سے ملاقات کے لیے کہا، ہمیں استقبالیہ کمرے میں بٹھانے کے تھوڑی دیر بعد ہی مولوی صاحب کا ملاقات کے لیے پیغام آ گیا۔ چنانچہ ہم گئے تو کمانڈر مولوی عبداللطیف ابراہیمی امیر جہاد قندوز و حدود روس حاجی عبدالرؤوف ابراہیمی امیر نظامت حدود روس اور استاذ طارق امیر امور سیاسی صوبہ قندوز وحدود روس نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ تعارف کے بعد گفتگو شروع ہوئی، پندرہ بیس منٹ بات چیت جاری رہی۔ اس بات چیت میں جو سب سے زیادہ اہم اور خوش کن بات تھی وہ یہ کہ مولوی صاحب نے بتلایا کہ ہم الحمدللہ روس کے اندر جا کر کارروائیاں کرتے رہے ہیں۔ میں نے پوچھا اب تو یہ کارروائیاں نہیں ہوتی ہوں گی؟ کیونکہ تاجکستان جو کبھی روس کا حصہ ہوا کرتا تھا آج وہ آزاد ہے۔ تو تقریباً میرے ہم عمر نوجوان امیر جہاد نے کہا وہاں اب بھی پوسٹوں پر روسیوں کا کنٹرول ہے اور جو باقی حکام ہیں وہ بھی وہی پرانے کمیونسٹ ہیں کہ جن کے ذہن، نظریات اور عادات واطوار وہی ہیں یعنی وہ نجیب جیسے ہیں ...... چنانچہ ہمارا جہاد جو روسیوں کے وقت سے ہم نے شروع کر رکھا ہے، وہ جاری ہے، یہ کبھی ختم نہ ہوگا اور ابھی حال ہی میں ہم دو تاجکستانی گروپوں کو تاجکستان کے اندر بھیج چکے ہیں، ان میں سے ایک گروپ تیرہ جب کہ دوسرا پچاس افراد پر مشتمل تھا، انھیں ہم نے یہاں ٹریننگ دی ہے اور دریائے آمو کے پار بھیجا ہے۔

گفتگو کے آخر پر میں نے دریائے آمو دیکھنے کی خواہش کی تو کمانڈر نے ایک کلاشن بردار مجاہد ہمارے ساتھ روانہ کیا، گاڑی کا پوچھا تو ہم نے کہا کہ گاڑی ہمارے پاس موجود ہے، چنانچہ گاڑی تک انھوں نے ہمیں الوداع کیا اور ہم دریائے آمو کی طرف چل دیے۔

دریائے آمو کے کنارے بندر شیر خان میں:

اب ہمارا رخ بندر شیر خان کی طرف تھا، راستے میں ہمیں دو تین جگہ چوکیوں پر مجاہدوں نے روکا مگر جونہی انھیں ہمارا ہمراہی مجاہد آگاہ کرتا کہ یہ کمانڈر صاحب کے پاکستانی مہمان ہیں تو محبت اور تشکر بھرے جذبات سے ہمارا راستہ صاف کر دیا جاتا۔ دس پندرہ منٹ بعد ہم بندر شیر خان میں تھے۔

ہم ابھی جیپ سے اترنے کی تیاری کر رہے تھے کہ مجاہد نے بندر شیر خان کے کمانڈر کے پاس جا کر ہمارا تعارف کرا دیا۔ چنانچہ ہم اندر گئے تو والہانہ ملاقات کے بعد ہم اس دارالضیافہ میں بیٹھے جہاں بڑے بڑے جرنیل کھانا کھایا کرتے تھے، صوفے اور ٹیبل سجے ہوئے، قالین بچھے ہوئے تھے، مجاہدین ابھی یہاں ناشتہ کر کے اٹھے ہی تھے کہ ہم پہنچے تو ہمارے لیے ناشتہ چن دیا گیا۔ ناشتہ کرتے رہے، باتیں کرتے رہے، جہاں کبھی روسی جرنیل کھانا کھاتے ہوئے پاکستان تک کو روندنے کی باتیں کیا کرتے تھے آج ہم ناشتہ کرتے ہوئے اپنے مجاہدین کے لیے ماسکو تک یلغاریں کرنے کی سوچیں سوچ رہے تھے۔ کمانڈر صاحب عربی خوب جانتے تھے اس لیے عربی میں اور کبھی درمیان میں پشتو اور فارسی میں بھی کوئی بات کر لیا کرتے۔ ناشتے کے بعد ہم باہر نکلے تو اردگرد اس بڑی بلڈنگ میں کئی دفاتر تھے، وسیع وعریض سرسبز لان تھا، مجاہدین کا گھوڑا اب اس لان میں گھاس چر رہا تھا۔

ایران اور افغانستان میں ''بندرگاہ'' کو صرف ''بندر'' کہتے ہیں، چنانچہ اس بندرگاہ کا نام بندر شیر خان ہے۔ اب ہمارا رخ دریائے آمو پر بنی ہوئی بندر شیر خان کی عمارت کی طرف تھا، تو مندان صاحب کا گائیڈ بھی ہمارے ہمراہ تھا۔ جب ہم دریا کے کنارے پہنچے تو یہ واقعی

بندر گاہ تھی جبکہ دریا میں مال بردار کشتیاں اور سامان اٹھا نے والی کرینیں بھی کھڑی تھیں۔دریا بہت بڑا تھا،گہرا اور خاموش تھا،ہمیں بتلایا گیا کہ کبھی اس دریا میں کشتیوں کے ذریعے لمبی مسافت طے ہوتی تھی، بندر شیر خان سے حیرتان و ترمذ اور اس سے آگے تک کشتیاں چلتی تھیں۔

بندرگاہ پر واقع روسیوں کی لائبریری میں بھی ہم گئے، یہاں لینن اور مارکس کی کتابیں دیکھنے کو ملیں ، اللہ کے انکار پر مبنی دہریت کالٹریچر اب زمین پر بکھراپڑا تھا۔افغان کمیونسٹ لیڈر ببرک کارمل اور نجیب وغیرہ کے حوالے سے بھی افغانیوں کو دہریت کا سبق دینے والا لٹریچر موجود تھا۔یہی وہ جگہ تھی جہاں سےلٹریچر آتا اور پورے افغانستان میں پھیلایا جاتا مگر اب اس سارےلٹریچر اورنظریے کا قرآن نے منہ توڑ دیا ہے۔چنانچہ اب یہ سارالٹریچر جمع کر کے کچھ تو دریائے آمو کی نذر کیا جائے گا اور کچھ یادگار کےطور پر باقی رہے گا تاکہ آنے والی نسلیں اس احمقانہ لٹریچر کو دیکھ کر اس کے انجام سے عبرت حاصل کریں۔

لائبریری سے نکلے تو ساتھ ہی اس دفتر میں گئے جس میں بڑا روسی جرنیل بیٹھا کرتا تھا اور یہاں کے معاملات کی نگرانی کیا کرتا تھا۔اس دفتر سے نکلنے کے بعد ہم نے دریا کے کنارے تاجکستان کا نظارہ کیا،ننگی آنکھ کے ساتھ اور دوربین کے ساتھ اس سرزمین کو دیکھا کہ جو آج روسی درندوں کی زندیق چیلیوں سےتو آزاد ہوگئی ہےمگر ابھی اس کے دانتوں سے کلی طور پر خلاصی نہیں ہوئی۔

وہ اس طرح کہ مولوی عبداللطیف صاحب نے مجھے بتلایا کہ ابھی تک ترکستان یعنی ازبکستان، تاجکستان، قازقستان، کرغستان اور ترکمانستان میں اہم پوسٹوں پر روسی ہی براجمان ہیں اور جو مسلمان حکمران ہیں تووہ بھی وہی پرانے کمیونسٹ ہیں جوسیکولرازم کے حامی حتیٰ کہ سابق نجیب اوراس کے حواریوں کےطرف دار اور مجاہدین کے مخالف ہیں کہ مجاہدین کے افغانستان میں کنٹرول حاصل کرنے سے انھیں بہر حال خطرہ ہے......لہٰذا افغان جہاد کی

برکت سے یہ علاقے آزاد ہوگئے ہیں مگر وہ کامل آزادی کہ جو کبھی اس علاقے کا طرۂ امتیاز ہوا کرتی تھی تو وہ ابھی باقی ہے۔۔چنانچہ اب میں بندرگاہ کے پلیٹ فارم سے نیچے اترا، دریائے آمو کہ جسے دریائے جیحون بھی کہا جاتا ہے، اس کے پانی سے وضو کیا......اس عزم کے ساتھ کہ اے دریائے جیحون......! عنقریب تیرے پانیوں سے پھر مجاہدین وضو کرکے اپنے مالک کے حضور جھکتے اور دعائیں مانگتے ہوئے اور ہاتھوں میں کلاشنکوفیں تھامے تجھ سے پار (ماوراء النہر) سمرقند وبخارا سے آگے اوفا اور تازان سے اس طرف دریائے وولگا سے پار داغستانی لشکروں کو ہمراہ لے کر ماسکو کی طرف بڑھنے والے ہیں۔

اے دریائے آمو......! روسی تجھے پار کرکے ان دونوں راستوں سے بھاگے ہیں مگر ہم مجاہدین روس کے تعاقب میں شاہراۂ سالانگ پر حیرتان بندر سے اور شیر خان بندر سے اپنا سفر جاری رکھیں گے۔ (ان شاء اللہ)

روس کی سیر

افغانستان سے ترکستان تک روس کے تعاقب میں:

اللہ عز وجل کی توفیق سے افغانستان میں دریائے آمو تک پہنچ گیا تھا لہٰذا اب ۳ اگست ۹۲ء کو سوا بارہ بجے پی آئی اے کے بوئینگ پر سوار ہوا اور پھر اپنے ہم سفر ساتھ حافظ عبدالعزیز کے ہمراہ پاکستان کے بعد افغانستان کی فضاؤں میں اڑ رہا تھا کہ پائیلٹ نے کچھ یوں باخبر کیا:

''اس وقت ہم مزار شریف کے اوپر محو پرواز ہیں اور اب دریائے آمو پار کر کے ازبکستان میں داخل ہوتے ہوئے ترمذ پر اڑ رہے ہیں۔''

جی ہاں!.....ٹھیک اسی جگہ آج سے چار سال قبل روسی افواج کا سربراہ جنرل گرموف جب اپنی فوج کو افغانستان سے بھگا کر یہاں پہنچا تھا تو شاہراہ سالانگ پر مجاہدین اس کے تعاقب میں تھے، وہ اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ دریائے آمو پر افغانستان کی سرحدی چوکی ''حیرتان'' سے وہ جلدی جلدی پل عبور کر کے ترمذ میں داخل ہوا۔ وہ سراپا حیرت میں ڈوبا ہوا تھا، سوچ رہا تھا کہ روس تو جہاں گیا وہاں سے نکلا نہیں مگر اب یہ ہمارے ساتھ کیا ہوا؟ حیرتان سے گزرتے ہوئے اس حیرت و استعجاب نے اس کی مت اس حد تک ماردی کہ اس نے جو تقریر اپنی افواج کے سامنے افغانستان میں کرنا تھی اسے وہ ترمذ میں بھی نہ کر سکا، صحافیوں کے روبرو بس وہ اتنا سا شکست خوردہ اور ذلت آمیز جملہ بول سکا:

''آج کا دن وہ دن ہے کہ جس کا ہمیں کئی سالوں سے انتظار تھا''۔

یہ دن ۱۵ فروری ۱۹۹۲ء کا دن تھا کہ گراموف یہاں یہ دن بھی گزار نہ سکا، جہاد کا خوف اسے آگے بھگا لے گیا۔

آج سے بارہ سال قبل امام ترمذی کے اس شہر کے راستے قدرے آزاد ازبکستان میں جانے کا کسی کے دل میں کوئی تصور اور خیال تک نہ تھا مگر جہاد نے اسے عملی حقیقت کا روپ دے دیا اور آج اللہ نے جہاد کی برکت سے ہمارے لیے یہ ممکن بنادیا کہ اڑھائی گھنٹے کی فلائیٹ کے ذریعے ہمیں تاشقند ایئر پورٹ پر اتار دیا گیا۔ ہوائی جہاز سے لاؤنج میں آئے تو دو گھنٹے کلیرنس میں لگ گئے، سارا عملہ روسی تھا۔ کسٹم کا طریق کار یہ تھا کہ جس کے پاس آم کی پیٹی تھی اس سے تین چار آم رکھ لیے، جس کے پاس کپڑا تھا اس سے تھوڑا سا کپڑا رکھ لیا اور جس کے پاس جیکٹیں تھیں اس سے ایک جیکٹ رکھ لی۔ یعنی یہ کسٹم عملہ کیا تھا یہ تو ہمارے ہاں سبزی منڈی میں بولی دینے والوں کا ایک گروہ تھا کہ جو آڑھتیوں کی طرح سبزی اور فروٹ کی ٹوکریوں سے اپنی چونگی وصول کر رہا تھا۔

ماسکو کا سفر:

ہمارا ویزا یکم اگست سے ۱۵ اگست تک تھا اور وہ بھی صرف ازبکستان کے تین شہروں تاشقند، ثمرقند اور بخارا کے لیے کہ جسے اسلام آباد کے روسی سفارت خانے نے جاری کیا تھا، پھر تین اگست کو ہم یہاں پہنچے تھے، لہٰذا ہمارے پاس صرف ۷ دن تھے۔ تاشقند آ کر ۲۴ گھنٹوں کے اندر ہم نے اپنے آنے کی اطلاع کرنا تھی، وہ بھی نہ کر سکے اور اپنے اللہ پر توکل کرتے ہوئے ماسکو کا پروگرام بنا لیا۔ تین دن تاشقند میں لگ گئے اور پھر دو نوجوان جو کہ عربی زبان سے آشنا تھے، ہمارے ہمراہ ہو لیے۔ ماسکو کا ٹکٹ خریدا اور سات اگست کو چھ بجے صبح ہم تاشقند سے ماسکو کی طرف روانہ ہوئے۔

ہمارا ٹکٹ درجہ دوم کا تھا اور ہم چار ساتھیوں کے لیے چار بیڈز پر مشتمل پورا کیبن ہمارے تصرف میں تھا، بستر تو پہلے ہی اوپر موجود تھے، اب صاف ستھرے سفید تولیے اور چادریں بھی فراہم کر دی گئیں، گاڑی چل پڑی اور ہم مصروف گفتگو ہو گئے۔ تب ایک روسی افسر ہمارے

پاس آیا اور ہمارے ساتھیوں سے ٹکٹ دکھانے کو کہا، انہوں نے ٹکٹ دکھائے تو کہنے لگا یہ جو غیر ملکی ہیں ان کے لیے تین گنا زیادہ پیسوں کا ٹکٹ ہوتا ہے، وہ کیوں نہیں خریدا؟ ساتھیوں نے کہا ہمیں پتا نہیں تھا اور یہ ٹکٹ بھی ہم نے ہی خریدا ہے۔ اس کے بعد اس نے ہمارے پاسپورٹ اور ویزے دیکھنا شروع کر دیے، کچھ دیر دیکھنے کے بعد اس نے بغیر کوئی اعتراض کیے ہمیں ہمارے کاغذات واپس کر دیے اور چل دیا۔ ہم سمجھتے ہیں یہ خالص اللہ کا کرم تھا جو ہم پر ہوا کہ اس نے پھر نہ تین گنا وصول کیے اور نہ ہی کاغذات پر کوئی اعتراض کیا۔

گاڑی آدھا گھنٹہ چلی ہوگی کہ اب قازقستان شروع ہوگیا اور پھر متواتر دو دن تک گاڑی قازقستان میں چلتی رہی۔ یہ مسلمانوں کی سب سے بڑی ریاست ہے، اس کا رقبہ انڈیا کے رقبے کے برابر ہے اور آبادی دو کروڑ کے قریب۔ قازقستان میں ہم نے کپاس کی فصلیں بھی دیکھیں اور صحرا بھی، جنگلات بھی دیکھے اور شہر بھی، مگر جو خاص شے دیکھی وہ خوبصورت عمارتیں تھیں کہ ایک بڑے سے کمرے کے چار کونوں پر مینار ہیں، درمیان میں گنبد ہے اور ایک ہی جگہ پر سو سو، دو دو سو کے قریب یہ عمارتیں، میں سمجھا کہ یہ ولیوں کے مزارات ہوں گے مگر اس قدر؟ اور پھر قازقستان میں......اب میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا بھئی! یہ آبادیاں ہیں یا ولیوں کے مزار؟ تو وہ کہنے لگے یہ تو عام لوگوں کے قبرستان ہیں، قازقستان میں قبرستان ایسے ہی ہوتے ہیں جبکہ انھیں بنانے والے خود بے چارے کچے گھروں میں رہتے ہیں مگر کوئی مرتا ہے تو ساری پونجی اس کی قبر پر لگا دیتے ہیں۔

گاڑی میں دوسرے دن ہم ساڑھے بارہ بجے کے قریب ''اورنبرگ'' شہر میں پہنچے۔ اب ہم یورپ میں تھے، ایشیاء کی زمین ختم ہو چکی تھی، شہر کے نام سے اس پورے علاقے اور ریاست کا نام بھی ''اورنبرگ'' ہے۔ اس کا رقبہ ایک لاکھ بارہ ہزار کلومیٹر مربع ہے۔ نہر ''اورال'' جو ''بشکیریا'' سے آتے ہوئے اس ریاست سے گزرتی ہے اور ''بحر خزر'' میں گرتی ہے، تو یہ ماضی میں مسلمانوں کی عظمتوں کے نشان اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ''اورنبرگ'' شہر اسی نہر کے کنارے آباد ہے۔ یہ شہر جو کبھی اسلامی تاریخ میں بڑا اہم شہر ہوا کرتا تھا آج

یہاں آدھ گھنٹہ کے لیے گاڑی رکی تو میں پلیٹ فارم سے باہر نکل کر اس شہر میں گھومتا رہا مگر اب یہاں اسلامی عظمت کا کوئی نشان نہ تھا، روسیوں نے مقامی مسلمانوں کو اٹھا کر ادھر ادھر دھکیل دیا، اکثر کو قتل کر دیا اور اب یہاں روسیوں کی اکثریت ہے۔ مگر اس کے باوجود بھی بشکیر، قازاق اور تاتار مسلمان کافی تعداد میں ہیں اور ان کا اسلام صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں۔

اگلے دن یعنی 9 اگست کو ساڑھے تین بجے ہم ماسکو کے ریلوے سٹیشن پر تھے، ہم نے تین دن اور دو راتیں گاڑی میں گزاریں۔

گاڑی میں دوران سفر ہمارے ساتھی عبدالقدوس اور ابوالرشید دینی مسائل پوچھتے رہے، قرآن حفظ کرتے رہے اور جس قدر وہ حفظ کر لیتے میں اس کا ترجمہ اور تفسیر انھیں پڑھا دیتا۔ اسی طرح سے ہمارا سفر بحمد للہ بڑا بابرکت اور خوشگوار رہا۔

ماسکو میں:

جتنا عرصہ ہم نے گاڑی میں گزارا اتنا ہی ماسکو میں قیام رہا۔ ہم ریلوے سٹیشن سے میٹرو کے ذریعے جامع مسجد میں پہنچے۔ یہاں نماز ادا کرنے کے بعد ہم نے طلباء کا ہوسٹل ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ وہاں پاکستانی طلباء بھی ہوں گے، ان سے ماسکو کے بارے کچھ معلومات لیں گے۔ خیر ہم شام کے وقت طلباء کے ہوسٹل میں پہنچے تو وہاں مختلف ملکوں کے طلباء موجود تھے، یہ سب روسی بلاک کے ممالک کے طلباء تھے۔ یہاں کچھ نوجوان کاروبار کے لیے طالب علم بنے ہوئے تھے۔ ہمارا واسطہ ایسے ہی پاکستانی نوجوانوں سے پڑا، یہ لوگ چار سو ڈالر دے کر یہاں یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات میں داخلہ لے لیتے ہیں اور پھر کاروبار کرتے ہیں اور آگے جرمنی، فرانس وغیرہ میں جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی نیا ملک پاکستانیوں کے علم میں آئے بس پھر کیا ہے، ایجنٹ حضرات سبز باغ دکھاتے ہیں اور لوگ گھر بیچ کر نکل کھڑے ہوتے ہیں اور سب کچھ لٹا کر گھر کا رخ کرتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورتحال آج کل یہاں بھی موجود ہے۔

ہم انہی پاکستانیوں کے پاس ہی رات ٹھہر گئے، پھر کچھ نہ پوچھیے رات کیسی گزری۔ یہ ہوسٹل یوں تھا جیسے جنگل میں جانوروں کا مسکن ہو، شور شرابا اور ہوہا کی بلند آوازیں، اور ہوتی کیوں نہ کہ لڑکوں نے شراب پی رکھی تھی، روسی لڑکیاں ان کے ہمراہ تھیں، رقص کا دور چل رہا تھا، کہیں کہیں نشے میں وحشت آپس میں لڑائی جاری تھی، شراب کی بوتلیں فرش پر ٹوٹ رہی تھیں ...... پچھلی رات تک یہ مشق جاری رہی اور پھر یہ لوگ سوئے تو دن کے بارہ بجے اٹھے۔ صبح کے وقت ایسے تھا جیسے یہاں کوئی آدمی موجود نہ ہو۔

غور کیجیے! یہ ہیں وہ ہاسٹل کہ جہاں کمیونسٹ ملکوں کے لوگ تعلیم حاصل کرتے تھے اور واپس اپنے ملکوں میں جاکر روس کی مدد سے وہ انقلاب برپا کرتے تھے اور پھر وہ پورے ملک کو ان ہاسٹلوں جیسی رہائشوں میں بدل دیتے تھے۔ افغانستان کا ببرک کارمل، حفیظ اللہ امین اور ڈاکٹر نجیب اللہ کہ جس نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی تو یہاں ماسکو سے ہی اور انہی ہاسٹلوں میں رہا اور افغانستان کا صدر بن کر اس نے وہاں وہی کچھ کیا جو ان ہوسٹلوں میں وہ کیا کرتا تھا۔ اس قدر گندے ماحول میں بھی چند اللہ والے ہمیں مل گئے، عشاء کی نماز پڑھنے کے لیے ہم نے وضو کا ارادہ کیا، کمرے سے باہر نکلے تو برآمدے میں یمن کا طالب علم مل گیا، سلام دعا اور عربی میں گفتگو ہوئی۔ نماز کا ذکر ہوا تو اس نے کہا ہم نے ہوسٹل میں ایک کمرے کو مسجد بنا رکھا ہے۔ اب ہم وہاں پہنچ گئے، اذان ہوئی، یمن، الجزائر اور مراکش کے عرب طلباء اکٹھے ہوگے، مجھے آگے کر دیا گیا، میں نے نماز پڑھائی، نماز کے بعد کافی دیر اکٹھے بیٹھے گفتگو کرتے رہے۔ طلباء کہنے لگے یہاں تو ہر روز ایسے ہی ہوتا ہے۔ بہر حال ہمیں ہمارے ملک والوں نے بھیجا ہے، ہم تعلیم بھی حاصل کر رہے ہیں اور دین کو بھی تھامے ہوئے ہیں۔

ماسکو کی جامع مسجد کے خطیب سے ملاقات:

ماسکو میں دو مسجدیں ہیں، ایک تو ابھی واگزار ہوئی ہے، یہ پرانی اور تاریخی مسجد ہے جبکہ مرکزی مسجد جو کہ ماسکو میں منعقد ہونے والی اولمپک گیمز کی بلڈنگ کے ساتھ واقع ہے، یہ کبھی بند نہیں ہوئی۔ دس اگست کو ہم اس مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے گئے تو اس کے دفتر

میں حسن حضرت سے ملاقات ہوگئی۔ یہ مسجد کے امام اور نائب خطیب ہیں۔کوٹ کے ساتھ انھوں نے ٹائی لگا رکھی تھی، کلین شیو تھے اور سر پر سفید پگڑی تھی، اپنے خوبصورت اور ماڈرن سوٹ سے مزین دفتر میں براجمان تھے۔ان کا سیکرٹری بھی کلین شیو نوجوان لڑکا تھا۔مغربی لباس زیب تن کیے دو نوجوان لڑکیاں بھی موجود تھیں،لڑکے بھی تھے، ہمارے آنے پر وہ چلے گئے۔ امام صاحب سے تعارف ہوا اور پھر گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ امام صاحب عربی نہیں جانتے تھے۔ میں نے سوچا چلو بول نہیں سکتے تو سمجھتے تو ہوں گے مگر وہ اس سے بھی قاصر تھے.....تھوڑی دیر بعد ہی میں نے حضرت صاحب سے داڑھی کا سوال کر دیا، اب انھوں نے کافی دیر جواب دینے میں لگا دی۔حاصل کلام یہ تھا کہ داڑھی تو عیسائی رکھتے ہیں، یہ تو ان کی نقل ہے حالانکہ حضرت صاحب کو ٹائی میں ان کی نقل نظر نہیں آتی تھی۔میں نے کہا عیسائیوں کی مخالفت صرف ان کاموں میں ہے جن میں اللہ کے رسول ﷺ نے مخالفت کی ہے اور یہ کہ عیسائیوں کی مخالفت ان کے غلط کاموں میں ہے۔اب اگر عیسائی رفاہ عامہ کا کام کریں تو ہم اس سے رک جائیں گے؟ اس کے بعد حضرت صاحب کہنے لگے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی داڑھی زندگی کے اوائل میں تھی اور آخر میں نہیں تھی، اس لیے میری بھی نہیں ہے۔اس پر میں نے ''نعوذ باللہ'' کہہ کر اللہ کی پناہ مانگی اور امام صاحب سے کہا کہ آپ مجھے اس کی دلیل دیں۔ وہ الٹا مجھے کہنے لگے آپ دلیل دیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کی داڑھی تھی۔ اس پر میں نے انھیں داڑھی کی حدیثیں پڑھ کر سنا دیں اور کہا کہ امام بخاری، ترمذی اور نسائی جو ترکستان میں پیدا ہونے والے عظیم محدثین ہیں، ان کی کتابیں مجھے دیجیے میں دلائل آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ اس پر امام صاحب خاموش ہو گئے اور پھر اس کے بعد ہم نے اس جاہل انسان سے گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا اور دفتر سے نکل کر مسجد میں آ گئے۔

سنا تھا کہ مسجد میں ظہر اور عصر کی دو نمازیں باجماعت ہوتی ہیں مگر آج تو وہ بھی دیکھنے میں نہیں آئیں۔البتہ نوجوان جوڑے ضرور مسجد میں آتے، امام صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے اور پھر چلے جاتے۔ یہ عقدہ ہم پر اس وقت کھلا جب اس دفتر کے دروازے پر ہماری

نظر پڑی، وہاں لکھا ہوا تھا اسلامی مسائل معلوم کرنے کا دفتر اور یہ کہ نکاح کی فیس کم از کم ۲۰۰ روبل ہے۔ اب پتا چلا کہ یہ جو عریاں لباس میں جوڑے یہاں آئے ہیں یہ نکاح کے لیے آئے ہیں اور پھر حضرت صاحب بھی واپس جانے لگے تو اب ان کی پگڑی بھی غائب تھی اور ایک سوٹڈ بوٹڈ نوجوان ہاتھ میں بریف کیس تھامے واپس گھر جا رہا تھا، بالکل اسی طرح جس طرح دفتر میں کوئی بابو ڈیوٹی دے کر واپس جاتا ہے۔

اب سمجھ میں آیا کہ ماسکو چونکہ دارالحکومت ہے، مسلم ممالک کے سربراہ یہاں آتے تھے، اب وہ مسجد میں جانا چاہیں، جمعہ پڑھنا چاہیں تو ان کے لیے محض دکھاوے کے لیے روس نے یہ انتظام کر رکھا تھا۔ اس ضرورت کے علاوہ مجھے ایسے امام کی اور کوئی حاجت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

کریملن کی سیر اور ریڈ سکوائر میں لینن کی لاش:

ماسکو میں کریملن وہ جگہ ہے جہاں روس کے بادشاہ رہا کرتے تھے۔ پھر زاران روس کی بادشاہی ختم ہوئی اور یہاں کمیونسٹ حکمرانوں کا بسیرا ہوا۔ اب کریملن میں یلسن کا دور ہے۔ کریملن جو کہ کئی مربع اراضی پر پھیلا ہوا ہے، ہم اسے دیکھنے کے لیے گئے تو ریڈ سکوائر میں دس دس روبل کی ٹکٹیں فروخت ہو رہی تھیں، لوگ خرید رہے تھے، ہم نے بھی خریدیں اور پھر ۳۵۔۴۰ مردوں اور عورتوں کے قافلے کو ایک معلم کی سربراہی میں دے دیا گیا اور وہ ہمیں لے کر کریملن کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ اسی طرح گروپ بنتے جا رہے تھے اور انھیں معلمین جو کہ مرد اور خواتین تھیں، ان کے حوالے کیا جا رہا تھا...... جس گروپ میں ہم تھے اس کے معلم نے کوئی پندرہ بیس جگہوں پر کھڑے ہو کر دس دس اور پندرہ پندرہ منٹ تقریر کی۔ ایک جگہ پر آگ جل رہی تھی، اردگرد پھول پڑے تھے، یہاں زاروں نے کمیونسٹوں کو قتل کیا تھا۔ ایک جگہ مینار تھا یہاں کمیونسٹ مفکرین مارکس اینجلس وغیرہ کے نام لکھے ہوئے تھے۔ کریملن کے اندر گئے تو کہیں زاروں کی رہائش تھی اور کہیں ان کے آثار کا عجائب گھر...... ایک جگہ جہاں چار گرجا گھر تھے اور یہ کافی بڑے اور تاریخی تھے، ان میں سے ایک گرجا گھر کا تعارف کراتے

ہوئے روسی معلم نے کہا کہ اس کی تعمیر کے لیے ماسکو کے بادشاہ نے روم سے کاریگر منگوائے اور اسے بڑے اہتمام سے تعمیر کرایا۔

روسی معلم کی اس بات کا ترجمہ جب میرے مترجم ساتھی نے روسی سے عربی میں کیا تو میری نگاہوں کے سامنے تاریخ کے وہ اوراق گھومنے لگے کہ جب ۸۵۷ھ میں عثمانی خلیفہ سلطان محمد فاتح نے عیسائیوں کے سیاسی اور مذہبی مرکز قسطنطنیہ شہر پر قبضہ کرلیا اور اس کا نام بدل کر استنبول رکھ دیا، جس کا معنی ترکی زبان میں ''دارالاسلام'' ہے، مسلمانوں کا اقتدار اور عظمت اس وقت عروج پر تھی کہ ایک طرف ترکوں نے آرتھوڈکس عیسائیوں کے مرکز پر قبضہ کرلیا تھا اور پھر آگے بڑھ کر مشرقی یورپ کے ملکوں یوگوسلاویہ، بلغاریہ، رومانیہ اور ہنگری تک کو فتح کرلیا، دوسری جانب سارا ترکستان اور دریائے وولگا کے کنارے پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی اور ماسکو تو ایک چھوٹی سی ریاست تھی جو کبھی مسلمانوں کی باجگزار ہو جایا کرتی تھی اور کبھی آزاد..... اب ۸۸۶ھ میں ماسکو کے بادشاہ نے روس کو مضبوط کرنا شروع کردیا اور عزم کرلیا کہ وہ قسطنطنیہ کا بدلہ مسلمانوں سے لے کر رہے گا۔ یہاں کے امراء نے قسطنطنیہ میں عیسائیوں کے مرکز کو ماسکو میں منتقل کرلیا، کریملن میں گرجے بن گئے اور تیاریاں شروع ہوگئیں، تاتاری مسلمانوں اور روسی عیسائیوں کے درمیان لڑائیاں نئے سرے سے شروع ہوگئیں..... خیر یہ تو تاریخی باتیں ہیں مگر اس وقت جو قابل غور بات تھی وہ یہ کہ کمیونسٹ انقلاب تو مذہب کا دشمن تھا اور انھوں نے مسلمانوں کی کوئی مسجد باقی نہ چھوڑی مگر کریملن میں گرجے باقی ہیں ان گرجوں پر لوہے کی منوں وزنی گھنٹیاں باقی ہیں۔۲۲ ٹن کا یک بڑا گھڑیال بھی یہاں پڑا تھا اور ان گرجوں کے میناروں پر جو سونے کے پترے ہیں اور سونے کی صلیبیں ہیں، کمیونسٹوں نے انھیں بھی ہاتھ نہیں لگایا تو کمیونسٹ جو کہ مذہب دشمن تھے ان کا نشانہ بھی اس انقلاب کی زد میں اسلام ہی تھا اور یہ اسی دشمنی کا بدلہ تھا جسے زاروں نے شروع کیا اور کمیونسٹوں نے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

کریملن دیکھنے کے بعد اب اس کے مرکزی دروازوں کے درمیان دیوار کے ساتھ ہی

عمارت کی طرف چل دیے، اس میں لینن کی حنوط شدہ لاش رکھی گئی ہے، سامنے کھلا میدان ہے جسے ریڈسکوائر کہا جاتا ہے،یہیں کمیونسٹ انقلاب کی سالانہ پریڈ ہوا کرتی تھی جسے دیکھنے کے لیے دنیا بھر کے اکثر سربراہ آیا کرتے تھے۔

کارل مارکس یہودی کے فلسفے کو عملی جامہ پہنانے والے لینن کی لاش کو دیکھنے کے لیے ایک لمبی لائن لگ چکی تھی، تلاشی بڑی سخت تھی، پولیس والوں نے مجھ سے کیمرا بھی رکھوا لیا۔ جب ہم اس کے قریب پہنچے تو پہرے داروں کی گارڈ تبدیل ہو رہی تھی، عیسائیوں کے مذہبی گھڑیال کی گھنٹیاں کریملن کے گرجا نما میناروں سے بجیں اور پھر ساکت وجامد کھڑے دو پہرے داروں کی جگہ دوسرے پہرے دار آکر کھڑے ہوگئے۔ ماسکو کے شو رومز میں مومی مجسمے رکھے ہوتے ہیں، یقین جانیے یہ پہرے دار بھی مومی مجسمے ہی لگتے تھے، یہ مین گیٹ کے دائیں بائیں آمنے سامنے کھڑے تھے جب ہم یہاں سے گزرنے لگے تو ان کو دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی، پہرے دار کہ جس کے لیے ہنسی ممنوع ہے، وہ بھی تھوڑا سا مسکرائے بغیر نہ رہ سکا...... اب ہم اندر چلے گئے، ہمارے ساتھی عبدالقدوس کے سر پر ٹوپی تھی، ایک پہرے دار آگے بڑھا اور اس نے ٹوپی سر سے اتار کر عبدالقدوس کے ہاتھ میں تھما دی یعنی ان کے ہاں سر پر ٹوپی رکھ کر لینن کی زیارت کرنا لینن کی توہین تھی۔ خیر اب ہم اندر چلے گئے، وہاں لینن جامد وساکت پڑا تھا، ٹائی اور کوٹ پہنے ہوئے تھا، روشنیاں اس کے جسم پر پڑ رہی تھیں، باقی اندھیرا تھا۔

اب ہم لینن کے مقبرے سے باہر آچکے تھے اور مقبرے کے پیچھے باقی روسی سربراہوں کی قبریں تھیں اور ہر قبر پر صاحب قبر کا مجسمہ تھا...... یہ برزنیف ہے جس نے روسی فوج کو افغانستان میں داخل کیا، وہ مرگیا تو اس کے بعد آندروپوف تھا، اس کی قبر بھی یہاں تھی...... چرلنکو بھی یہیں دفن تھا۔ اس کے بعد گورباچوف آیا اور پورا کمیونزم نظام ہی دفن ہوگیا...... گورباچوف اب یہاں دفن نہیں ہو سکے گا، اس لیے کہ اس کے دور میں کمیونزم جو دفن ہو گیا ہے۔

غرض یہ بیسویں صدی کے فرعونوں کا دور تھا جس کا کچومر جہاد کی ضربات حق نے نکالا۔ مصر کے فرعونوں کی لاشوں کو بھی حنوط کر کے مقبرے بنائے جاتے تھے اور جو سب سے بڑا فرعون موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ہوا اس کی لاش آج بھی سامان عبرت ہے، جو اللہ کی قدرت سے سمندر میں غرق ہونے کے بعد محفوظ ہے۔ اس فرعون نے اپنے وزیر ہامان کو کہا تھا کہ ایک بلند وبالا محل تیار کرو تاکہ میں اس پر چڑھ کر دیکھوں کہ موسیٰ کا رب کہاں ہے اور پھر وہ پاگل اس محل پر چڑھ کر آسمان کی طرف تیر چلاتا رہا اور پھر کہتا رہا کہ موسیٰ کا رب مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا......سٹالن کے بعد روسی سربراہ خروشیف بھی ایسا ہی جدید روسی فرعون تھا کہ اس کا سائنسدان جب پہلا خلائی سیارہ اسپوتنک خلاؤں میں اڑا کر واپس آیا تو خروشیف نے کہا ہم نے زمین کے گرد چکر لگا لیے، خلاؤں میں گھوم لیا، ہمیں مذہبی جنونیوں کا رب کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔

غور کیجیے! ان دونوں پاگل فرعونوں کی ذہنیت ایک ہے، اس نے اپنے زمانے کے مطابق پکی اینٹوں کے محل پر چڑھ کر ایک بات کہی اور آج کے اس فرعون نے آگ میں ڈھالے ہوئے لوہے کی مشین یعنی جہاز پر چڑھ کر وہی بات دہرائی ......دونوں کا دور گزر چکا، مجسمے باقی رہ گئے، لاشیں سامان عبرت ہیں۔

جہاد وقتال ......زندہ باد

ہر باطل نظام......مردہ باد

اللہ تعالیٰ نے اپنے ماننے والوں کو ایک بار پھر آگاہ کر دیا ہے کہ مجھ پر مضبوط ایمان رکھ کر جہاد وقتال کے راستے پر چلتے رہو گے تو پھر سنت یہی ہے کہ باطل مٹتا رہے گا، حق ابھرتا رہے گا۔

شیطانی مذہب اور سٹالن کا انجام:

کریملن اور لینن کو دیکھنے کے بعد پہلا تصور جو صاحب فکر وعقل کے ذہن میں پیدا ہوتا

ہے وہ یہ ہے کہ کمیونزم کے الحادی نظریے کو جس نے پھانسی دی وہ تو بلاشبہ اسلام کا نظریہ جہاد وقتال ہے، جس کا عملی مظاہرہ افغانستان میں ہوا، جب کہ فکری طور پر کمیونزم اپنی حرکتوں سے ہی اعلان کر رہا تھا کہ وہ نا کام ہے......اب ایک طرف تو وہ مذہب کو افیون کہتا تھا، عبادت کو فضول رسومات کے نام سے تعبیر کرتا تھا، اس مقصد کے لیے اس نے مساجد ڈھادیں، کلیسے بند کر دیے، کہیں کوئی ایک آدھ کلیسا بھی نقصان سے دوچار کر دیا......مگر اس نظام کے حاملین نے اپنے لیے ایک نیا معبود گھڑ لیا اور اس کے ساتھ دوسرے کئی معبود......کیا لینن کا مقبرہ عبادت گاہ نہیں؟ اس کے احسانات تلے دب کر اس کی لاش کو حنوط کر کے اس کا احترام نہیں کیا جاتا؟ مجسموں کی طرح وہاں جو پہرے دار کھڑے کیے ہیں ان کا کیا مقصد ہے؟ اس کے احترام کے لیے سر پر ٹوپی نہ رکھنے دینا آخر یہ عبادت کی رسم نہیں تو اور کیا ہے؟ بیرونی سربراہ یہاں آئیں اور ہاتھ باندھے ایک منٹ کے لیے ساکت وجامد اس کی لاش پر کھڑے رہیں، یہ عبادت نہیں تو اور کیا ہے......؟ پھر کمیونسٹوں کے اس معبود کے جو حواری ہیں وہ گویا کہ ولی ٹھہرے۔ ان کے مجسموں، ان کی یادگاروں پر پھول چڑھانا اور آگ کا جلایا جانا یہ مراسم عبادت نہیں تو اور کیا ہیں......؟ غرض کمیونسٹوں نے لاکھوں انسانوں کا قتل عام کیا، عبادت گاہیں مسمار کر دیں، کتب خانے جلا دیے ماں، بہن اور بیٹی کے احترام تک کو ختم کر دیا اور کہا کہ یہ بھی مذہب ہے اور اشتراکیت یہ ہے کہ یہ محض عورتیں ہیں، عورت ہونے کے ناتے بلا امتیاز ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے، یہ احترام وغیرہ سب مذہبی افیون ہے......کمیونسٹوں نے عملی طور پر یہ سب کچھ روس میں کر دکھایا اور سب مذہبوں کو ختم کر کے انھوں نے کمیونزم کا ایک مذہب بنا لیا۔ لینن اور اس کے حواریوں کی پوجا شروع کر دی......حقیقت یہ ہے کہ عبادت کا تصور انسان کی فطرت میں ہے اور وہ اپنی فطرت سے جدا نہیں ہوسکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنے حقیقی معبود کی عبادت نہیں کرے گا تو شیطان کی عبادت کرے گا اور غیر اللہ کی عبادت شیطان ہی کی عبادت ہے، وہ غیر اللہ کمیونسٹوں کا لینن ہو، ہندوؤں کا رام ہو، عیسائیوں کا سینٹ پال ہو یا مسلمان کہلانے والوں کا قبر میں مدفون کوئی ولی ہو......اس کی عبادت دراصل

شیطان کے راستے کی پیروی ہے اور شیطان کے راستے کی پیروی ابلیس ہی کی عبادت ہے۔

لینن کے بعد سٹالن کہ جس کا ظلم وبربریت تاریخ کا ایک حصہ ہے، اس کی قبر پر پہنچا تو مجھے اس کی بیٹی ''سویلانہ'' یاد آگئی کہ جس نے اپنے باپ کی موت کو دیکھ کر روس چھوڑ دیا تھا اور امریکہ جا پہنچی، اس نے عیسائیت اختیار کرلی، اس نے دنیا والوں کو بتایا کہ جب میرا باپ مرنے لگا، وہ کہ جو رب کو گالیاں نکالا کرتا تھا اور اسے ماننے والوں کو سائبیریا کے ٹھٹھرتے اور جامد برفانی علاقوں میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا کرتا تھا.....اس ظالم پر جب نزع کا وقت آیا، آنکھیں پتھرا کر آسمان کی طرف جالگیں تو اس کی بیٹی ''سویلانہ'' کہتی ہے کہ میرا باپ ہاتھ اٹھاتا، انگشت شہادت آسمان کی طرف کرتا اور پھر ہاتھ نیچے گر جاتا، وہ زبردست کرب میں مبتلا تھا مگر بول نہ سکتا تھا، وہ اپنے عمل سے بتلا رہا تھا کہ میں جسے نہ مانتا تھا اب اس کی گرفت میں ہوں، کاش! بولنے کو ایک آدھ منٹ مل جائے، تو بہ کرلوں، لوگوں کو اپنے اور ان کے خالق ومالک سے باخبر کردوں مگر اس نے اپنے پیشرو فرعون موسیٰ کی طرح وقت ضائع کردیا تھا، وہ فرعون کہ جو اپنے آپ کو رب کہلاتا تھا، جب ڈوبنے لگا تو کہنے لگا میں اب موسیٰ اور اس کے رب پر ایمان لایا.....اللہ کا فرشتہ آگے بڑھا، منہ میں مٹی ڈال دی کہ اب ایمان کا کیا فائدہ؟ یہ تو نزع کا وقت ہے، توبہ کے دروازے بند ہونے کا وقت ہے، دنیا امتحان گاہ تھی، وہاں امتحان ہوچکا، اب تو نتیجہ سننے کا وقت ہے۔ چنانچہ اب اسے سنے اور دیکھے بغیر چارہ نہیں.....دیکھ کہ اب تیرا بنتا کیا ہے؟

اللہ کی طرف سے ایسے ہی لوگوں کے لیے قرآن میں اعلان موجود ہے:

ذُقۡ إِنَّكَ أَنتَ ٱلۡعَزِيزُ ٱلۡكَرِيمُ ﴿٤٩﴾ (الدخان:٤٩)

''(عذاب کا مزہ) چکھ تو (دنیا میں) بڑا جابر اور معزز بنا پھرتا تھا۔''

اور یہ سزا اس لیے ہوگی کہ:

إِنَّهُۥ كَانَ لَا يُؤۡمِنُ بِٱللَّهِ ٱلۡعَظِيمِ ﴿٣٣﴾ (الحاقہ:٣٣)

''وہ عظمتوں والے اللہ تعالیٰ کو مانتا ہی نہ تھا۔''

مجھے ایک قازق مسلمان نے بتایا کہ اسی کے دور میں ہمارے گاؤں کے پانچ آدمیوں نے اپنے گھر کے ایک کمرے میں نماز پڑھی، انھوں نے سٹالن کی تصویر پر کپڑا ڈال دیا کہ اس کے دور میں ہر گھر کے اندر اس کی تصویر لٹکانا ضروری قرار دے دیا گیا تھا...... ان مسلمانوں نے نماز تو پڑھ لی مگر رب کے حضور سر جھکانے کی خبر حکومت کو مل گئی۔چنانچہ نماز کی ادائیگی اور سٹالن کی تصویر پر پردہ ڈالنے کے جرم میں ان پانچ آدمیوں کو گرفتار کر لیا گیا، اس کے بعد آج تک کسی کو خبر نہیں کہ ان پانچ نمازیوں کے ساتھ کیا بیتی......؟

ڈالر پری کو پکڑنے کی دوڑ:

کمیونزم کی ناکامی کے بعد روس میں سرمایہ داری کی جانب دوڑ تیز ہوگئی ہے مگر یہ دوڑ صنعت لگانے یا محنت کرنے کی صورت میں نہیں بلکہ ڈالر کے حصول کے صورت میں ہے۔ہم جب یہاں آئے تو ایئر پورٹ پر ۱۳۵ روبل کا ایک ڈالر ملا، اس کے بعد ۱۵۰ کا اور یہ بڑھتے بڑھتے اب دوسو چالیس تک پہنچ گیا ہے۔ لہٰذا ہر شخص زیادہ سے زیادہ ڈالر جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ خود بخود ہی بڑھ جاتا ہے، محنت کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس صورتحال سے روبل گرتا جا رہا ہے اور مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے، ہر شخص ڈالر ہی کے ذریعے راتوں رات امیر بننا چاہتا ہے۔ ان لوگوں کی غیر ملکیوں پر خاص طور پر نظر ہوتی ہے کہ اس کے پاس ڈالر ہوں گے۔ ریلوے اسٹیشن میٹرو اسٹیشن اور شہر کی اکثر بارونق جگہوں پر اوباش نوجوانوں کے غول دکھائی دیں گے، موقع ملے تو یہ لوٹنے اور قتل تک کرنے سے گریز نہ کریں گے۔ہم سے نہ جانے کتنے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کے پاس ڈالر ہیں؟ ہم چار ساتھی تھے، یقین جانیے اکیلے کا تو کوئی حال نہیں۔ مجھے پاکستانی نوجوانوں نے بتلایا کہ ابھی اسی چکر میں ایک پاکستانی نوجوان کو چند دن پہلے روسی اوباشوں نے قتل کر دیا...... ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ نوجوان غیر ملکی سے ڈالر پوچھتے ہیں کہ ہم تبدیل کر دیتے ہیں، وہ تبدیل کرنے کے لیے جونہی ڈالر نکالے گا یہ جھپٹ کر بھاگتے بنیں گے اور کہیں شنوائی نہ ہوگی۔ ریلوے سٹیشن پر دیکھا کہ ٹکٹیں بلیک میں فروخت ہو رہی ہیں، پولیس گھوم رہی ہے، لوگوں کو ٹکٹ نہیں مل رہا،

لڑکیاں اور لڑکے ہاتھوں میں ٹکٹ تھامے بلیک میں فروخت کر رہے ہیں۔غرض پوری قوم پیسے کے پیچھے بھاگ رہی ہے اور پیسے سے روس میں جو شخص جو کام بھی چاہے وہ کروا سکتا ہے۔ عام لوگ تو رہے درکنار خود حکومت کا یہ حال ہے کہ غیر ملکیوں سے ریلوے ٹکٹ کی قیمت تین گنا زیادہ۔ ہوائی جہاز سے سفر کیا جائے تو ڈالروں میں۔ اچھے ہوٹلوں میں رہا جائے تو وہ بھی ڈالر مانگیں گے......اور تو اور تاشقند میں ائیر پورٹ کا قلی جو ہمارا سامان ٹرالی پر رکھ کر باہر لایا وہ بھی ڈالر مانگتا تھا۔ بہر حال ان ڈالرخوروں سے بچا جائے تو پھر روس مہنگا نہیں بلکہ روبل کے حساب سے غیر ملکیوں کے لیے بہت سستا ہے۔

سرمایہ داری کی یہی وہ دوڑ ہے کہ جس کا حل لینن نے اشتراکیت میں ڈھونڈا اور ستر سال تک وہ اور اس کے جانشین اسی کوشش میں لگے رہے مگر ستر سال بعد وہ جہاں سے شروع ہوئے تھے وہاں سے بھی بدتر حالت میں جا گرے اور اب پھر یہ قوم برطانیہ اور امریکہ کے پیچھے دوڑ رہی ہے، جمہوریت کو اپنا رہی ہے، ڈالر کو پوج رہی ہے اور عیسائیت کے ساتھ اسی طرح کی برائے نام وابستگی اختیار کر رہی ہے جیسی وابستگی امریکہ اور برطانیہ میں ہے۔اور جو لوگ عیسائیت کے ساتھ مذہبی وابستگی کا عملی اظہار کرتے ہیں تو وہ اظہار وہی ہے جو فرسودہ، دقیانوسی، غیر عقلی اور مشرکانہ ہے۔کریملن کے سامنے ایک کونے میں ولیوں کے دو مجسمے تھے ،ایک روسی لڑکی یہاں کھڑی تھی، دیا جلائے ہوئی تھی اور نذرانے وصول کرتی تھی۔ اسی طرح اتوار کے روز کئی چوکوں پر میں نے دیکھا کہ مذہبی لوگ ایک میز پر دیے جلائے، ولیوں کی تصویریں لٹکائے،صلیب رکھے ہوئے نذرانے وصول کر رہے ہیں اور یہ عقیدہ رکھے ہوئے ہیں کہ اتوار کو ولیوں کی روحیں آتی ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان کے ہاں اتوار کو آتی ہیں ہمارے ہاں جمعرات کو آتی ہیں۔(اللہ کی پناہ ان خرافات سے)

لینن کی لاش دیکھ کر سامنے بڑے بازار میں آیا تو اعلان ہو رہا تھا کہ ماسکو کی سیر کے لیے بسیں تیار ہیں، جو جانا چاہیں ٹکٹ حاصل کر کے بسوں میں بیٹھ جائیں ۔ہم بھی ٹکٹ لے کر بس میں جا بیٹھے، بس چل پڑی، ایک شخص ماسکو کی تاریخ بتلاتا رہا اور پھر ایک بڑے قبرستان

میں داخل ہوا۔ یہاں ولیوں کے مزار تھے، ان کی قبروں پر پھول تھے اور چراغ جل رہے تھے اور یہ شخص زائرین کو ان کے قصے، کرامات اور دیگر خرافات سے آگاہ کر رہا تھا.....تو اب یہ ہے روسی قوم کا حال کہ جن خرافات سے بھاگ کر اس نے کمیونزم کو اپنایا تھا، ستر سال کی ٹھوکروں کے بعد مذہبی، معاشی اور سیاسی طور پر پھر ستر سال پیچھے جا پہنچی ہے.....کاش! جس نظریے نے اسے ستر سال پیچھے دھکیلا ہے اس کے حاملین اور آگے بڑھیں اور اسے اس حق سے آشنا کریں جو اللہ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ لے کر آئے ہیں۔

ماسکو میں میٹرو:

ماسکو کراچی کی طرح بہت بڑا شہر ہے مگر سڑکیں صاف ستھری، بڑی بڑی اور رش سے پاک۔ رش نہ ہونے کا سب سے بڑا سبب میٹرو یعنی زیر زمین ٹرین ہے۔ یہ زمین کے نیچے پورے ماسکو میں پھیلی ہوئی ہے، ہر سٹیشن پر خود کار سیڑھیاں ہیں جن سے لوگ ایک جانب نیچے اتر رہے ہوتے ہیں اور دوسری جانب اوپر چڑھ رہے ہوتے ہیں۔ آٹھ دس بوگیوں کی گاڑی ہوتی ہے، ہر سٹیشن پر دو پلیٹ فارم ہوتے ہیں، ایک گاڑی کی آمد کے لیے اور دوسرا روانگی کے لیے۔ دونوں گاڑیاں بیک وقت اور ہمہ وقت آ جا رہی ہوتی ہیں، انتظار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ان کی رفتار بھی تیز ہے۔ ایک روبل میں بے شک سارا ماسکو زیر زمین گھومتے رہیں۔ ہر اہم جگہ یہ میٹرو ٹرین جاتی ہے البتہ اسے سمجھنا خاصا مشکل کام ہے۔ ایک سٹیشن پر لکھا تھا ۱۹۰۵ء یعنی یہ کام ان لوگوں نے بیسویں صدی کے اوائل سے شروع کر رکھا ہے اور جوں جوں شہر پھیلتا گیا توں توں یہ میٹرو بھی پھیلتی چلی گئی۔

دوسرا یہ کہ تمام روسی شہروں میں زمین کے اوپر سڑک کے درمیان بھی ڈبل ریلوے لائن موجود ہے، دو دو بوگیوں کی ٹرین آ جا رہی ہے اور ان کے دونوں جانب کاریں اور بسیں چل رہی ہیں۔ ان بسوں میں بجلی والی بسیں بھی ہیں ان سڑکوں پر ریلوے لائینیں اس انداز سے بچھائی گئی ہیں کہ بجلی پر چلنے والی ان ٹرینوں کی لائینوں کو کاریں اور بسیں بھی کراس کر لیتی

ہیں۔

یہاں اختلاط مرد و زن کے نہایت شرمناک مناظر تھے۔نیز انتڑیوں میں ڈال کر سور کا گوشت جگہ جگہ لکڑیوں کی طرح لمبی قطار کی شکل میں بکتا ہوا دیکھا۔شراب اس طرح نوش کی جاتی ہے جس طرح پیپسی اور فانٹا۔ سچی بات ہے یہ سب کچھ دیکھ کر دل گھبرا اٹھتا ہے کہ کب اس گندے اور غلیظ ماحول سے جان چھوٹے گی، ماسکو سے تو بہرحال نکل بھاگنے کا فیصلہ کر لیا۔ حافظ عبدالعزیز تو عبدالقیوم کے ہمراہ ماسکو میں ٹھہر گئے جبکہ میں نے اپنے ساتھی ابو الرشید کو لیا، تازان کا ٹکٹ خریدا اور ریل کے ذریعے ۱۱ اگست کو رات پونے گیارہ بجے ماسکو سے نکل کھڑے ہوئے، اللہ نے چاہا تو دوبارہ ماسکو میں آئیں گے جس طرح کہ ہمارے آباء آیا کرتے تھے،تب ماسکو میں سور اور شراب نہیں ہوگی بلکہ یہ شہر انگریزی کے لفظ ''Mosque'' کا عملی منظر پیش کر رہا ہوگا۔ہمارے اس فقرے کو لوگ پاگل پن کہیں گے مگر یہ تو اس وقت بھی کہتے تھے جب افغان مجاہدین نے روس سے ٹکر لی تھی، اللہ کے رسول ﷺ پیٹ پر پتھر باندھے جب غزوۂ خندق میں قیصر و کسریٰ کی فتح کی نوید سنا رہے تھے تو آج کے دانشوروں کی طرح اس وقت کے دانشور رؤسائے عرب بھی ایسی ہی باتیں کرتے تھے کہ کھانے کو ملتا نہیں اور قیصر و کسریٰ کو زیر کرنے کی باتیں ہیں۔مگر اللہ نے بتلا دیا ہے کہ میں اسی راستے یعنی جہاد و قتال سے ہی مجاہدوں کے ہاتھوں سپر پاروں کو زیر و زبر کیا کرتا ہوں۔

گم کردہ عظمتوں کی تلاش میں
قازان سے آستراخان تک

دریائے وولگا کے کنارے کنارے:

ہم دونوں ساتھی ماسکو سے قازان جانے والی گاڑی کے کیبن میں جا کر بیٹھ گئے، میں قازان کے تصور میں گم تھا کہ روسی عورت ہمارے کیبن میں داخل ہوئی اور بیٹھ گئی، پھر ایک اور نوجوان عورت عریاں لباس میں سامنے آ کر براجمان ہوگئی۔ یہ چار آدمیوں کے لیے کیبن تھا، رات یہیں گزارنا تھی۔ اب گاڑی چل چکی تھی اور ہم دونوں سوچ میں پڑ گئے کہ اب ہم کیا کریں اور کہاں جائیں......یا اللہ! تو ہی مدد کر اور پھر دو تین منٹ نہ گزرے ہوں گے کہ دو تاتاری نوجوان ہمارے کمرے میں داخل ہوئے، السلام علیکم کہا اور کہنے لگے ہم نے آپ کو دیکھا، ہمارا کیبن ساتھ والا ہے، وہاں ہمارے ساتھ بھی دو عورتیں ہیں، ہمارا دل چاہتا ہے کہ آپ کے پاس رہیں۔ہم نے کہا ہم تو پہلے ہی پریشان تھے، اس پریشانی سے نجات مل جائے تو اور کیا چاہیں گے، ان عورتوں کی منت کریں یہ اکٹھی ہو جائیں اور ہم مسلمان بھائی یہاں اکٹھے ہو جائیں۔ اللہ نے ہماری سن لی، یہ لڑکیاں مان گئیں اور ہم چاروں بھائی اکٹھے ہو گئے۔(الحمدللہ)

ہمارے یہ دونوں ہم سفر نوجوان ساتھی آزاد اور مالدار تاتاری تھے، ماسکو میں اعلی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اب کاروبار کرتے تھے، ہم نے اکٹھے کھانا کھایا، تعارف ہوا، ہلکی پھلکی

گفتگو ہوئی، نماز پڑھی اور پھر سو گئے.....صبح بیدار ہوئے، نماز اور ناشتے کے بعد گفتگو شروع ہوئی، روس کے موجودہ حالات میں مسلمانوں کے احوال سے انھوں نے مجھے آگاہ کیا اور مجھ سے انھوں نے پاکستان کے احوال، جہاد افغانستان کی یادیں، ایران وعراق اور پھر عراق اور کویت کی جنگ پر، پھر دینی مسائل پر انھوں نے مجھ سے سوالات کیے، اللہ کی توفیق سے میں انھیں جوابات دیتا رہا اور وہ بغور سنتے رہے۔

آخر میں ان صالح طبیعت نوجوانوں سے دو باتیں عرض کیں، ایک یہ کہ آپ تاتاریوں کو روسی گھٹن کے بعد اتنی سی آزادی ملی ہے کہ جس قدر چاولوں کی ایک دیگ سے ایک چاول اٹھا کر اس کا ذائقہ زبان کی نوک پر چکھا جائے اور یہ انتہائی قلیل سی آزادی آپ کو افغان جہاد کی برکت سے ملی ہے.....اب آپ کا فرض یہ ہے کہ آپ اسلام کو سمجھیں اور اسلام کو سمجھنے کے لیے کتاب وسنت کی طرف رجوع کریں، قرآن کا مطالعہ کریں، بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی جیسی احادیث کی کتب پڑھیں اور پھر مسلمانوں کو اس طرف دعوت دیں۔ فی الحال یہ دعوت کا کام کریں، مذہبی تعصبات کی دعوت سے بچیں اور یہ سیدھی سادی اسلام کی دعوت لوگوں کو دیں، آپ نے اس قوم کو دوبارہ نئے سرے سے مسلمان بنانا ہے۔ عظمتوں کی طرف دوبارہ سفر شروع کرنے کی یہ پہلی سیڑھی ہے، اگلی منزلیں بعد میں آئیں گی۔

یہ گفتگو جاری تھی، راستے میں آنے والے دیہات اور قصبات کا تعارف بھی جاری تھا، سارا علاقہ بڑا ہی خوبصورت اور شاداب تھا، ریلوے لائن کے دونوں جانب درختوں کی ایک قطار تھی جو ماسکو سے لے کر قازان تک ہمراہ رہی .....ہم ساڑھے بارہ بجے قازان میں پہنچ چکے تھے۔

تاتارستان کی تاریخی سیر:

تاتارستان میں اسلام کا پیغام پہنچانے کا شرف عرب تاجروں کو حاصل ہے.....یہ عرب تاجر کہ جن میں نذیر حزمی ایک ممتاز داعی کی حیثیت رکھتے تھے، ان سے متاثر ہوکر تاتارستان

کے بادشاہ بلطوار نے اسلام قبول کرلیا۔اس کے بعد نذیر حزمی کو ہی بادشاہ نے تاتاری وفد کا قائد بنا کر عباسی خلیفہ المقتدر باللہ (۲۹۵ھ تا ۳۲۰ھ) کی خدمت میں وفد بھیجا اور درخواست کی کہ وہ ایسے داعیوں کو ہمارے پاس بھیجیں جو ہمیں دین اسلام سمجھائیں اور پھر یہاں مسجدیں بنائی جائیں خلیفہ نے اس وفد کا بڑا احترام کیا اور پھر جوابی طور پر بادشاہ بلطوار کے پاس وفد بھیجا۔جس میں ابن فضلان بھی شامل تھے، انھوں نے اس سارے سفر کی روداد لکھی جو کہ رسالہ ابن فضلان کے نام سے معروف ہے۔

شاہ بلطوار کا ایمان افروز واقعہ:

خلیفہ کا وفد جب بادشاہ کے پاس پہنچا تو بادشاہ نے شاندار ضیافت کی، ضیافت سے فارغ ہوئے تو حسب رواج ایک شخص نے بادشاہ کے لیے منبر پر چڑھ کر دعا کی:

''اے اللہ! بلغار (تاتارستان) کے بادشاہ شاہ بلطوار کو سلامت رکھ۔''

اس پر ایک عرب نے کہا بادشاہ اللہ ہے اور ممبروں پر چڑھ کر کسی دوسرے کو بادشاہ کہنا مناسب نہیں اور پھر بادشاہ سے مخاطب ہوکر کہا کہ یہ امیر المومنین یعنی عباسی خلیفہ جو آپ کے امیر ہیں، انھوں نے بھی وصیت کر رکھی ہے کہ میرے لیے دعا کی جائے تو اللہ کا بندہ اور خلیفہ کہہ کر دعا مانگی جائے۔ اس پر بادشاہ نے پوچھا پھر میرے لیے کون سے الفاظ کہے جائیں جو جائز ہیں اس پر ابن فضلان کہتے ہیں میں نے کہا آپ کا اور آپ کے باپ کا نام لیا جائے۔تب بلطوار نے کہا میرا باپ تو کافر تھا، میں نہیں چاہتا کہ میرے نام کے ساتھ میرے باپ کا نام آئے جو کہ کافر تھا۔اس کے بعد بادشاہ نے خود ہی کہا میرے امیر کا نام کیا ہے۔ابن فضلان نے کہا ''امیر المومنین جعفر۔'' اس پر بادشاہ نے کہا تو کیا یہ نام میرے لیے جائز ہوگا؟ ابن فضلان نے ''نعم'' کہا تو بادشاہ نے فوراً کہا کہ آج کے بعد میرا نام جعفر ہے اور میرے باپ کا نام عبداللہ ہے۔لہٰذا اب دعا مانگنے والے نے یوں دعا مانگی:

''اے اللہ! اپنے بندے جعفر بن عبداللہ کو سلامت رکھ جو کہ بلغار کا امیر اور امیر المومنین کا تعلق دار ہے۔''

تاتاریوں پر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وہ ایک طرف ترکستان کے حکمران تھے، دوسری جانب قازان سے اوپر اوفا اور سائبیریا پر حکمرانی کرتے تھے، ماسکو کو انھوں نے تاراج کیا اور قازان سے لے کر آستراخان تک وہ حکمران تھے مگر ان ساری فتوحات کے باوجود دین اسلام ان میں اچھی طرح مستحکم نہ ہوسکا...... اللہ کا یہ قانون ہے کہ وہ کسی قوم کو ایسے ہی برباد نہیں کرتا بلکہ اس کے دیے ہوئے مواقع سے جب قوم فائدہ اٹھانے سے انکار کر دیتی ہے تو پھر اللہ کے غضب کا کوڑا حرکت میں آتا ہے۔ لہذا اس قوم کے قریب اسی دور میں اللہ نے امام محمد بن اسماعیل، ابوعیسٰی ترمذی اور نسائی جیسے محدثین کو پیدا کیا کہ جن کی لکھی ہوئی کتابوں کا سارا عالم اسلام رہتی دنیا تک محتاج ہے۔ مگر یہ لوگ جغرافیائی اور قومی اعتبار سے قریب ہونے کے باوجود ان محسنوں سے فائدہ نہ اٹھا سکے، کتاب وسنت کو مضبوطی سے نہ تھام سکے اور پھر مزید یہ کہ آپس میں انتشار کا شکار ہوگئے بصرف وولگا کا کنارا ہی تین ریاستوں قازان، سرائے اور آستراخان میں تقسیم ہوکر رہ گیا۔ پھر آپس میں لڑنے لگے اور اس لڑائی میں پھر وہ وقت بھی آیا کہ اپنے محکوم روسیوں سے ایک دوسرے کے خلاف مدد کے طالب ہونے لگے...... نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا تھا کہ یہ آہستہ آہستہ روسی قیصروں اور زاروں کے پنجوں میں جکڑتے چلے گئے...... حتیٰ کہ کمیونسٹ انقلاب آیا تو ان میں سے کئی وہ لوگ بھی تھے جو اپنی اور اپنے مذہب کی عافیت اس انقلاب میں سمجھنے لگے، کچھ مخالفت کرنے لگے کچھ ساتھ دینے لگے مگر پانی سر سے گزر چکا تھا، کمیونسٹوں نے اس علاقے پر قبضہ کرلیا جسے تاتارستان کہا جاتا ہے۔ اب میں اسی تاتارستان کے اہم شہر قازان میں تھا۔

قازان میں:

سب سے پہلے ہم قازان کی مرکزی اور بڑی مسجد مرجانی میں گئے۔ بڑی خوبصورت مسجد ہے، جب ہم اس میں پہنچے تو نماز ظہر ہو رہی تھی، نماز کے بعد مصر سے آئے ہوئے ایک عرب نے عربی زبان میں مختصر تقریر کی۔ امام مسجد نے اس کا تاتاری زبان میں ترجمہ کیا۔ نماز کے بعد امام صاحب سے ملاقات ہوئی اور پھر ریاض سعودی عرب کے سلفی نوجوان صالح بن

ریاض سے ملاقات ہوئی جو کافی دنوں سے اس سارے علاقے میں گھوم پھر رہے تھے۔ وہ کہنے لگے سب لوگوں کی توجہ کا مرکز ازبکستان ہے جبکہ اس دور دراز علاقے میں داعی حضرات کو زیادہ توجہ کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا میں دیہات میں بھی گیا ہوں، لوگ خود کو مسلمان کہتے ہیں مگر کلمہ تک نہیں آتا۔ یہاں دعوتی کام کے سلسلے میں ہم دونوں کے درمیان کافی دیر تبادلہ خیال ہوتا رہا، میں نے بعض تجاویز پیش کیں جنھیں شیخ نے پسند کیا۔

مرجانی مسجد کے بعد ہم قازان شہر میں کریملن یعنی ایوان صدر گئے، دریائے وولگا کے کنارے پندرہ بیس ایکڑ میں انتہائی خوبصورت مقام ہے اور یہ وہی مقام ہے جہاں بلطوار بادشاہ نے اسلام قبول کیا تھا، پھر زاروں نے اس پر قبضہ کیا تو انھوں نے یہاں مسجد کو ڈھا کر گرجا بنا دیا۔ میں جب اس گرجے کے قریب گیا تو دیکھ کر جگر پھٹنے لگا کہ جہاں اللہ واحد کی عبادت ہوتی تھی اب وہاں تثلیث کے پجاریوں کا قبضہ ہے اور وہ بھی اس انداز میں کہ اس سابق مسجد اور حالیہ گرجے کے اوپر صلیب بنائی گئی ہے اور صلیب کے نیچے ہلال بنایا گیا ہے۔ ہلال مسلمانوں کا نشان ہے اور صلیب عیسائیوں کا۔ یعنی صلیبیوں نے یہ کام کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ صلیب ہلال پر غالب آ گئی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہلال مجھ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہو کہ بس تمھاری دوڑ افغانستان تک ہی تھی جبکہ میں تو ابھی قازان میں مغلوب ہوں..... صلاح الدین ایوبی کے بیٹو! مجھے کب غلبہ نصیب ہوگا، توحید کے داعیو! توحید کا نشان تثلیث سے کب اونچا ہوگا؟ میرے نیچے مسجد عرصہ دراز سے رکوع وسجود کو ترس گئی ہے، اس میں کب اذان بلالی گونجے گی؟ کب اللہ اکبر کا آوازہ بلند ہوگا کہ جس کی گرج سے صلیب اور اس کے پجاری ٹوٹ کر رہ جائیں گے۔

ہاں .....تو یہی وہ مقام ہے جہاں عیسائیوں نے اور پھر کمیونسٹوں نے ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا، امیر قازان کو قتل کیا تھا، ملکہ قازان کو عیسائی بننے پر مجبور کیا تھا، اس نے انکار کیا تو اسے مینار پر لے جا کر پھینک دیا گیا۔ کریملن کی عمارت سے نکلے تو سامنے عجائب گھر تھا، ہم نے دیکھا کہ اس کے ایک حصے میں اب قرآن کے مخطوطات دوبارہ

رکھے گئے ہیں، جس جگہ یہ رکھے گئے ہیں وہاں اللہ جل جلالہ کے الفاظ کندہ کیے گئے ہیں۔ یہ سب کچھ کمیونزم کی بربادی کے بعد ممکن ہوا ہے۔

اب ہم شہر میں ایک پرانی اور تاریخی مسجد میں چلے گئے، یہ مکمل ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی، اب اسے نئے سرے سے تعمیر کیا جا رہا تھا، کمیونسٹوں کے دور میں یہ فیکٹری بنادی گئی تھی۔ کمیونسٹ جب اس شہر میں داخل ہوئے تھے تو انھوں نے اس شہر کی تمام مساجد کو بالکل ملیامیٹ کردیا تھا اور وہ مدارس کہ جہاں قرآن کی تعلیم دی جاتی تھی وہاں الحادی تعلیم کے سکول و کالج کھول دیے گئے۔ قرآن مجید اور دینی کتابیں جس جگہ سے شائع ہوتی تھیں اس پریس کو اور کتب کو جلاڈالا گیا۔ جن مدرسوں کو برباد کیا گیا ان میں اس وقت سات ہزار طلباء زیر تعلیم تھے۔

قازان کافی بڑا اور انتہائی خوبصورت شہر ہے، دریائے وولگا کے کنارے آباد ہے کہ جس میں بحری جہاز چلتے ہیں، اس سے اوپر ''اومورت'' اور ''جوفاش'' کی ریاستیں ہیں، دائیں جانب مشرق میں بشکیریا کی ریاست ہے، جس کا دارالحکومت ''اوفا'' شہر ہے۔ اس سے اوپر ''سبیر'' کا شہر ہے، اس شہر کے نام کی وجہ سے روس نے بحرالکاہل تک سارے علاقے کو ''سائبیریا'' کا نام دے دیا۔ یہ سارے علاقے تاتار مسلمانوں کے علاقے ہیں جہاں انھوں نے صدیوں حکومت کی ہے۔

قازان کے تاتاری مسلمانوں نے بتلایا کہ انقلاب کے بعد کمیونسٹوں نے لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا اور لاکھوں کو سائبیریا کی طرف پھینک دیا اور یہاں روسیوں کو لا بسایا، لہٰذا اب قازان میں اور قازان کے اردگرد قصبات اور دیہات میں عددی طور پر روسی اکثریت میں ہیں۔

دریائے وولگا کی لہروں پر بحری جہاز میں:

تاتاری مسلمان بھائیوں کا اللہ بھلا کرے کہ انھوں نے ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا وگرنہ اتنے کم وقت میں ہم قازان کا ہر اہم مقام کیسے دیکھ سکتے تھے۔ اب میں نے ان ساتھیوں سے کہا کہ جیسے بھی ہوسکے ہمارے لیے ٹکٹ کا بندوبست کریں۔ انھوں نے کہا کہ ریل کا ٹکٹ نہیں ملتا تو آپ بحری جہاز میں چلے جائیں، آپ کا پروگرام بھی آستراخان تک کا ہے اور یہ

بھی آستراخان تک جاتا ہے.....میں نے کہا اور کیا چاہیے اگر اس کا ٹکٹ مل جائے۔تو......
بہر حال ہم دریائے وولگا کے کنارے قازان بندرگاہ پر آ گئے، بڑی محنت اور کئی گھنٹے کی تگ ودو کے بعد آخرکار ان نوجوانوں نے ہمارے لیے فسٹ کلاس کے دو ٹکٹ حاصل کر لیے اور ہمیں جہاز کے اندر بٹھا دیا۔ میں نے ان بھائیوں کو اپنا ایڈریس دیا، شکریہ بھی ادا کیا اور جو تحائف میرے پاس موجود تھے وہ بھی اصرار کے ساتھ ان کو دیے۔

۱۲ اگست کو رات کے گیارہ بج کر دس منٹ پر ہمارا جہاز روانہ ہوا، یہ چار منزلہ جہاز بالکل اسی طرح تھا جس طرح فائیو سٹار ہوٹل ہو۔ ہمیں ہمارے کمرے کی چابی دے دی گئی، اس میں دو بیڈ لگے ہوئے تھے، صوفے تھے، ٹیبل موجود تھا، نیچے قالین بچھا ہوا، سفید دھلی ہوئی چادریں اور تکیے ہمیں فراہم کر دیے گئے، ایئر کنڈیشنڈ کمرا تھا، ریڈیو موجود، گرم اور سرد پانی کا بیسن موجود، استعمال کے برتن، کپڑے لٹکانے کے لیے الماری اور ہینگر حاضر، شیشے کی کھڑکی موجود کہ جس سے دریا کا منظر دکھائی دے۔

جہاز میں دو ریستوران تھے جن میں تین وقت کھانا دیا جاتا تھا جبکہ صبح کا ناشتہ مفت تھا، کھانا بھی انتہائی اعلیٰ اور نفیس ہوتا تھا، جہاز میں نہانے کے لیے حمام اور کپڑوں کے لیے استری تک کی سہولت موجود تھی۔

لینن کے شہر میں:

رات ہم سو گئے، صبح اٹھے، ناشتہ کیا اور پھر ہمارا جہاز ''ستاریامائینا'' کے گاؤں کے پاس لنگر انداز ہوا، یہاں اس نے پانچ گھنٹے قیام کیا پھر چل دیا اور دن کے چار بجے ''اولیانسک'' شہر کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ یہاں اس کا قیام پانچ گھنٹے تھا لہٰذا ہم شہر میں چلے گئے، بڑا خوبصورت شہر ہے، خاص طور پر بندرگاہ سے جب لمبی سیڑھیاں چڑھ کر شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس منظر کے حسن کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا.....ہم نے شہر میں مسجد ڈھونڈنا شروع کر دی، ایک ہی مسجد تھی سو ہم نے بحمدللہ ڈھونڈ نکالی۔ عصر کا وقت تھا، ہم مسجد میں داخل ہوئے تو ایک بوڑھی تاتارین عورت موجود تھی، اب ہم نے وضو کیا، ظہر اور عصر کی دونوں

نمازیں پڑھیں۔ بوڑھی اماں ہمیں دیکھتی رہی اور ذکر کرتی رہی۔ نماز کے بعد ہم اس کے پاس بیٹھ گئے، اماں کا نام پوچھا تو اس نے کہا میرا نام اللہ کے رسول ﷺ کی والدہ کے نام پر آمنہ ہے، میں مسجد کی خادمہ اور محافظہ ہوں۔ میں نے پوچھا کہ اس شہر کا پرانا نام کیا تھا جو مسلمانوں کے دور میں تھا؟ تو اس نے کہا اس کا پرانا نام ''سمبر'' تھا چونکہ اس شہر میں لینن پیدا ہوا تھا اس لیے اس کے دادا کے نام پر اس کا نام ''اولیانسک'' رکھ دیا گیا ہے جبکہ اس کے دادا کا نام ''اولیانوف'' تھا۔ مسلمانوں کے احوال پوچھے تو اماں رو پڑی، کہنے لگی یہاں سب مسلمان تھے، مسجدیں بھی کافی تعداد میں تھیں، انقلاب کے بعد مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا اور جو باقی بچے انھیں نہ جانے کہاں کہاں پھینک دیا گیا اور پھر ان کے بہترین گھروں میں روسیوں کو بسا دیا گیا، اب یہاں روسیوں کی اکثریت ہے مسجد میں صرف ظہر اور عصر کی جماعت ہوتی ہے، چند نمازی ہوتے ہیں جب کہ خطبہ جمعہ میں یہ مسجد بھر جاتی ہے، اب یہ ایک ہی مسجد ہے۔

مسجد کے ایک کونے میں سٹیل کا مینارہ بنایا گیا ہے، اس کے اوپر ہلال کا نشان ہے، اب یہ ہلالی مینارہ مسجد کے اوپر نصب کر دیا جائے گا۔ یقین جانیے ان علاقوں میں گھومتے ہوئے قدم قدم پر افغان جہاد کی برکت وعظمت کا ایک نیا نقش نئے انداز سے میرے ذہن میں منقش ہو رہا تھا...... اولیانسک میں اب پھر ہلال کا نقش بلند ہوگا......دریائے وولگا کے اس شہر میں افغان جہاد کا ایک اور نقش نہیں ابھرا تو آخر اور کیا ہوا ہے؟

کوئیبشیب شہر:

اگلے دن چودہ اگست کو جب پاکستان میں میرے ہم وطن یوم آزادی منا رہے تھے تو میں غلام دنیا میں اپنی متاع گم گشتہ تلاش کرتا پھر رہا تھا، اس شہر کے کنارے جہاز نے ساڑھے چار گھنٹے رکنا تھا اور پھر ہم اس بڑے شہر کی سڑکوں پر مسجد کا پتا پوچھتے پھر رہے تھے جو کبھی مسجدوں کا شہر ہوا کرتا تھا آج وہاں ایک ہی مسجد تھی وہ بھی شہر سے بہت دور اور اس کا پتا بھی چلا تو بڑی تگ و دو کے بعد۔ اس طرح کہ ایک روسی نوجوان نے کہا کہ میری بیوی تاتاری ہے اور میری ساس کو پتا ہوگا، وہ بھی میرے ساتھ ہی رہتی ہے۔ روسی کے یہ الفاظ سن کر کلیجہ

منہ کو آ گیا، میں فوراً سمجھ گیا کہ مسلمان قتل ہو گئے، عورتیں بچ گئیں، اب وہ اسی طرح روسیوں کے گھروں میں ہیں جس طرح پاک و ہند کی تقسیم کے وقت سے لے کر اب تک ہزاروں مسلمان عورتیں ہندوؤں اور سکھوں کے گھروں میں رہ گئی ہیں ......اور اب تو ستر سال گزرنے کے بعد ویسے ہی امتیاز ختم ہو چکا ہے، روسی سمجھتا ہے چونکہ میں روسی ہوں اس لیے عیسائی ہوں اور تاتاری سمجھتا ہے کہ میں چونکہ تاتاری ہوں اس لیے مسلمان ہوں، باقی نہ انھیں عیسائیت کا پتا ہے اور نہ انھیں اسلام کا۔

بہر حال وہ اپنی ساس سے پتا پوچھ کر آیا اور ہم مسجد کے قریب پہنچ گئے تھے مگر وہ اب بھی دور تھی، سر پر رومال رکھے ہوئے ایک بوڑھی تاتارین مسلمان عورت نے ہمیں بتایا کہ اب وہ زیادہ دور نہیں ہے مگر ہم کیا کرتے، وقت بہت بیت چکا تھا، اگر جہاز کھو جاتا تو پھر ہمارے پاس کیا رہ جاتا، لہٰذا ناچار ہم اپنا یہ مشن درمیان میں ہی چھوڑ کر واپس جہاز میں آ گئے۔

تفریح کے شیطانی مناظر اور ہم:

''کوبیشیب'' سے چلنے کے تھوڑی دیر بعد جہاز ایک ساحلی تفریحی مقام پر رکا، جہاز کے کپتان نے اعلان کیا کہ یہاں جہاز ڈیڑھ گھنٹہ رکے گا۔ہم دونوں ساتھی بھی اترے اور جنگل میں چلے گئے، وہاں گھوم پھر کر جب واپس جہاز میں آئے تو جہاز کے سب مردوں عورتوں اور بچوں نے کپڑے اتار رکھے تھے، نیکریں پہن رکھی تھیں، کوئی نہا رہا تھا، کوئی ساحل پر کھڑا تھا اور کوئی ریت پر جانوروں کی طرح لیٹ رہا تھا اور وہ شرمناک مناظر پیش کر رہے تھے کہ اللہ کی پناہ۔

خیر جہاز چل پڑا اور پھر ہم کھانا کھانے کے بعد چہل قدمی کرتے ہوئے جہاز کے پچھلے حصے کی طرف نکل گئے وہاں مرد اور عورتیں آفتابی غسل میں مصروف تھے، جسے ان کے ہاں (Sun Bath) کہا جاتا ہے۔ یہ شیطانی منظر دیکھتے ہی ہم جلدی سے واپس مڑے۔

دوسری جانب گئے تو نوجوان شراب پینے میں مصروف تھے، انھوں نے ہمیں بھی دعوت دی، ہم نے کہا ہمارا اسلام اجازت نہیں دیتا اور اجازت تو آپ کا مذہب بھی نہیں دیتا مگر

آپ کو پتہ ہی نہیں کہ آپ کا مذہب کیا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے ڈسکو ڈانس میں ہمیں شرکت کی دعوت دی، ہم نے کہا شراب جائز نہیں تو یہ مخلوط ڈانس کیسے جائز ہوگا؟ بہرحال وہ ہماری ان باتوں پر تعجب کر رہے تھے کہ یہ کیا مخلوق ہے اور کہاں سے آگئی ہے، جو نہ عورتوں سے بات چیت تک کرتی ہے نہ شراب پیتی ہے اور نہ ہمارے ساتھ ڈانس کرتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس موسم میں اکثر لوگ وولگا کا سفر ہی اس شیطانی تفریح کے لیے کرتے ہیں اور وولگا کا جو حسن ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، بعض جگہ تو یہ اس قدر چوڑا ہے کہ چوڑائی میں تا حد نگاہ پانی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا، کہیں درمیان میں انتہائی خوبصورت شاداب چھوٹے چھوٹے جزیرے دکھائی دیتے ہیں، پھر جہاں دریا کے کنارے دکھائی دیتے ہیں تو وہ انتہائی شاداب اور گھنے ہیں، ٹھنڈی ہوائیں جہاز کو چھوتی ہیں، مرغابیاں اور پرندے دریا میں تیرتے اور اڑتے ہیں اور جہاز دریا میں اس قدر سکون سے چلتا ہے جیسا کہ وہ زمین پر کھڑا ہو، چل نہ رہا ہو۔

اللہ کی توفیق سے ہماری تفریح یہ تھی کہ ان مناظر میں ہمیں اپنا رب یاد آتا تھا، میرا بھائی فتح اللہ قرآن یاد کرتا تھا اور میں اپنا سفرنامہ لکھنے میں مصروف ہوتا تھا۔ جب کمرے سے باہر نکلتے تو ایک کونے میں بیٹھ کر قرآن کا حسن اور سنگھار جسے اللہ کے رسول ﷺ نے ''عروس القرآن'' (قرآن کی دلہن) کہا ہے، اس کے چہرے سے نقاب اٹھاتے یعنی سورۃ الرحمن کی تلاوت کرتے اور اس سے ہمارے دلوں کو جو سرور، لطف اور فرحت ملتی تھی، اطمینان کی جو دولت ہاتھ آئی تھی خنزیر کھا کر، ام الخبائث پی کر اور شیطانی ڈانس کرنے سے وہ بھلا کہاں مل سکتی ہے؟

یہاں مجھے حیرانی ہو رہی تھی ان والدین پر کہ جو اپنی اولاد کو یورپ کے جہنم میں محض پیٹ پوجا کے لیے بھیجنے کو بڑا بے تاب رہتے ہیں...... یہاں کون سلامت بچتا ہوگا، سوائے اس کے کہ جس پر میرا رب رحم فرمائے۔ ایڈز کی ماری اس قوم میں اگر کوئی جائے تو پختہ ایمان

والا تجارت کے ساتھ ساتھ داعی کی حیثیت سے جائے، اس کے علاوہ یہاں جانا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ یہ مناظر دیکھ کر میری سوچ اور مشورہ یورپ کے عاشقوں کے لیے بہر حال یہی ہے۔ مجھے تو اب جو فکر لاحق تھی وہ یہی تھی کہ میرے آباء کی بستیوں میں، وولگا کے کنارے کون سی قوم آبسی ہے، وولگا کے مقدس کنارے اس سے کب پاک ہوں گے؟

''سرائے'' جواب ''ساراتوف'' ہے:

۱۵ اگست کو ایک بجے جہاز ایک ایسے شہر کے کنارے لنگر انداز ہوا جسے تاریخ اسلامی میں ''سرائے'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس شہر کی بنیاد چنگیز خان کے پوتے باتو بن جوجی خان نے رکھی تھی۔ باتو مسلمانوں سے بڑی شفقت اور رحم دلی سے پیش آتا تھا۔ باتو کے حصے میں قفقاس کے علاقے داغستان، خوارزم، قازان اور روس کے کچھ علاقے بادشاہی میں بطور ورثہ آئے، اس کے بعد اس نے ماسکو پر قبضہ کیا ''کیف'' کو زیر نگین کیا اور پھر پولینڈ تک جا پہنچا۔ باتو خان نے ''سرائے'' کو اپنا پایہ تخت بنایا، پھر جب باتو اور اس کا بیٹا بھی فوت ہو گیا تو باتو خان کا چچا برکہ خان باتو کی جگہ بادشاہ بنا۔ برکہ خان نے ۶۵۰ھ میں اسلام قبول کیا۔ وہ ابو المعالی ناصر الدین برکہ خان کہلایا...... اللہ کی قدرت ملاحظہ کیجیے کہ ایک جانب چنگیز کا پوتا ہلاکو خان بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا رہا تھا اور دوسری جانب جو کہ برکہ خان چنگیز کی ہی اولاد تھا، وہ سرائے میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی سلطنت کی بنیاد رکھ رہا تھا۔ اس ''سرائے'' کا نام اب روسیوں نے ''ساراتوف'' رکھ دیا ہے، اس شہر سے خاص طور پر مسلمانوں اور ان کی مسجدوں اور مدرسوں کا وجود مٹایا گیا ہے، صرف ایک مسجد ہے جو کہ بندرگاہ سے دس منٹ کے پیدل فاصلے پر ہے اور یہ بھی مکان خرید کر بنائی گئی ہے۔ اس مسجد میں اس کے خادم ایوب سے ملاقات ہوئی، وہ کہہ رہا تھا یہاں بھی صرف دو نمازیں با جماعت پڑھائی جاتی ہیں، ظہر اور عصر اور یہ بھی جمع کر کے ایک ہی وقت میں پڑھ لی جاتی ہیں، چند نمازی ہوتے ہیں جبکہ جمعہ میں ۵۰ کے قریب ہو جاتے ہیں۔

باتو نے اس شہر کی بنیاد رکھی برکہ خان کے اس شہر میں کہ کبھی ماسکو جس کے زیر نگیں ہوا

کرتا تھا، یہ حالت دیکھ کر دل بڑا مغموم ہوا مگر اس غم کی دوا بالآخر وہی نسخۂ جہاد ہے کہ جس کی تاثیر سے برکہ خان کے وارث بھی آگاہ ہو چکے ہیں اور تثلیث کے پجاری بھی۔

وولگا گراڈ:

۱۶ اگست کو صبح کی نماز پڑھنے کے بعد جب کمرے سے باہر نکلے تو ہمارا جہاز ایک سرنگ میں کھڑا تھا، اس کے آگے بھی ایک جہاز کھڑا تھا، اب اس سرنگ کا اگلا دروازہ بند ہونا شروع ہوگیا اور پچھلا بھی اور پھر پانی نیچے اترنا شروع ہوگیا حتیٰ کہ ہم چالیس فٹ تک نیچے چلے گئے، اب سامنے کا دروازہ کھلا اور ہم اگلی سرنگ میں چلے گئے، وہاں تیس فٹ نیچے چلے گئے، اب جہاز چل پڑا، اوپر جو پل تھا اسے کراس کرلیا اور اسی پل کو کراس کرنے کے لیے انجینئر نگ کا یہ حیرت ناک عجوبہ بنایا گیا ہے۔ باقی مقامات پر تو پل کافی بلند تھے، وہاں سے جہاز گزر جاتا تھا، مگر یہاں یہ منصوبہ اس لیے بنایا گیا ہے کہ پل اونچا نہیں ہے۔ جہاز یہاں سے گزر کر ایک گھنٹہ بعد وولگا گراڈ کے کنارے جالگا۔ قازان اور اولیانسک بھی بڑے خوبصورت شہر تھے مگر اس شہر کی بندرگاہ اور پھر کنارے پر سیڑھیوں کی شکل میں لمبے لمبے پارک اور پھر شہر میں گئے تو وہ بھی ایسا ہی حسین تھا۔ غرض اس کا حسن بھی اپنی مثال آپ تھا، اس شہر کا نام سٹالن گراڈ رکھا گیا اور اب اسے بدل کر وولگا گراڈ رکھ دیا گیا ہے۔ کمیونسٹوں نے اس میں بھی کسی مسجد کا وجود باقی نہیں رہنے دیا، حال ہی میں جو مسجد بنی ہے وہ ورگرا کے علاقے میں ہے، ہم ڈھونڈتے ہوئے اس میں پہنچے تو مسجد کے ساتھ قیام پذیر شامل صاحب سے ملاقات ہوئی، اس کے پاس چابیاں تھیں، اس نے مسجد کے تالے کھولے اور ہم مسجد میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ شامل صاحب نے بتایا کہ وہ روسی فوج میں ایک افسر کی حیثیت سے جلال آباد، لوگر اور دیگر کئی مقامات پر دوسال تک کام کرتا رہا ہے۔ شامل صاحب نے بتایا کہ میں اور میری بیوی مسجد کے خادم ہیں، اس لیے ہم مسجد کے ساتھ ہی رہتے ہیں جبکہ امام مسجد حمزہ صاحب ہیں جنھوں نے اوفا میں سال ڈیڑھ سال تک تعلیم حاصل کی ہے اور اب وہ یہاں کافی دور ایک

گاؤں میں ہیں۔

میں نے شامل صاحب سے پوچھا کہ انقلاب سے قبل تو شہر میں کافی مسجدیں ہوں گی؟ کہنے لگا بہت مسجدیں تھیں۔ اردگرد دیہات میں بھی تھیں، مسلمانوں کی بھی اکثریت تھی مگر اب یہ ایک ہی مسجد ہے جو حال ہی میں بنائی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اس مسجد میں بھی ظہر اور عصر کی دو نمازیں ہی ہوتی ہیں جبکہ جمعہ میں ۴۰۔۵۰ آدمی ہو جاتے ہیں۔ جب ہم اس مسجد سے نکلنے لگے تو اس نے ہمیں سورۃ الفاتحہ سنائی اور کہنے لگا کہ جب میں چھوٹا سا تھا تو میرے دادا نے جو کہ امام مسجد ہوا کرتے تھے انھوں نے سکھلائی تھی، بس یہی مجھے یاد رہ گئی اور کچھ نہیں آتا۔ اب ان شاء اللہ سیکھوں گا...... میں سوچ میں پڑ گیا کہ دادا نے تو پوتے کا نام شامل رکھا، اس امام شامل رحمہ اللہ کے نام پر جو کہ داغستان میں روسیوں سے لڑتا رہا مگر وہی پوتا افغان مجاہدین کے خلاف افغانستان میں روسیوں کے ہم رکاب رہا...... تو یہ ہے وہ انتقام جو روسی صلیبیوں نے مسلمانوں سے لیا ہے...... یقین جانیے اس کا قرض مسلمانوں کے سروں پر ہے اور جہاد کی بے شمار قسطوں میں سے ابھی تو ہم نے پہلی قسط کا ہی قرض اتارا ہے، وہ افغانستان میں اترا ہے جبکہ بقیہ اقساط اسی طرح موجود ہیں، وولگا کا کنارہ اس بات کی دہائی دے رہا ہے۔

آستراخان:

۱۷ اگست کو صبح ساڑھے دس بجے آستراخان پہنچے۔ قازان سے آستراخان تک ہمارا سفر پانچ دنوں میں مکمل ہوا، یہ سارا علاقہ یورپ میں ہے اور انتہائی اہم ہے، جس کے پاس یہ ہو اس کی زد میں ایک طرف ترکستان یعنی وسط ایشیا کی پانچ ریاستیں ہوتی ہیں، دوسری طرف آستراخان سے آگے بحر قزوین اور بحیرہ اسود کے درمیانی ممالک جو کہ سارے کے سارے مسلمانوں کے علاقے ہیں، یہ بھی اس کی دسترس میں ہوتے ہیں اور روس کہ جس کا دارالحکومت ماسکو ہے وہ بھی ان سے دور نہیں ہوگا کہ جن کا قبضہ وولگا پر ہوگا...... یہی وجہ ہے کہ روسی بادشاہوں نے بھی سب سے پہلے وولگا پر قبضہ کیا اور پھر کمیونسٹوں نے بھی اس دریا کے کنارے وہ ظلم ڈھائے، وہ قتل عام کیا کہ جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ دریائے وولگا کے

کنارے آباد شہر اور دیہات کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی آج وہاں روسیوں کی اکثریت ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر روسی کہاں سے آگئے حالانکہ ان کی شرح پیدائش مسلمانوں سے انتہائی کم ہے، سبب ظاہر ہے، روسیوں نے مسلمانوں کا قتل عام ہی اس قدر زیادہ کیا ہے کہ روسی تعداد میں ان سے بڑھ گئے۔

شہر آستراخان کے نام پر اس ریاست کا نام بھی آستراخان ہے، اس کی بندرگاہ پر پہنچتے ہی ہم نے ٹیکسی پکڑی اور ایک مسلمان بھائی محمد کے گھر جا پہنچے، وہ باہر نکلے تو ہم نے السلام علیکم کہا اور پھر ہم ایسے بغلگیر ہوئے جیسے برسوں کی جدائی کے بعد باہم ملے ہوں اور ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ بھائی محمد صاحب کتاب وسنت کے حامل، صحیح العقیدہ نوجوان عالم دین ہیں، باہمی تعارف کے بعد کھانا کھایا، نماز پڑھی اور پھر ہم آستراخان دیکھنے کو نکلے۔ شہر میں روسیوں کی اکثریت ہے۔ دوسرے نمبر پر تاتاری اور تیسرے نمبر پر قازق مسلمان ہیں۔ ہمیں بتلایا گیا کہ اس شہر میں ہر محلے میں مسجد تھی، مدرسے تھے مگر روسیوں نے ان کا وجود ہی ختم کر دیا، اب پانچ مسجدیں باقی ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ہم پہلی مسجد میں گئے، یہ حال ہی میں واگزار ہوئی ہے، اس کی مرمت کا کام ہو رہا تھا..... شہر کے وسط میں ایک مسجد دیکھنے گئے، یہ کافی بڑی مسجد تھی مگر اس کی چھت اور دروازے جلے ہوئے تھے، آگ سے دیواریں سیاہ تھیں اور جگہ جگہ سے مسجد کو توڑا پھوڑا گیا تھا، اس مسجد کے ساتھ تین منزلہ ایک کافی بڑی بلڈنگ تھی، ہمیں بتلایا گیا کہ یہ مدرسہ تھا جو مسجد کے ساتھ ملحق تھا مگر اسے کمیونسٹوں نے مینٹل ہسپتال بنا ڈالا، یہ آج بھی پاگل خانہ ہے۔ کمیونزم کے پاگل پن پر مبنی نظریہ تو مر گیا اور اسی پاگل پن کی وہ بھینٹ چڑھا مگر اب پاگلوں کو سبق سکھانے کے لیے اسے دوبارہ مرکز علم و دانش بنانے کے لیے اولو الالباب (صاحب عقل و خرد) اس مدرسے تک کب پہنچیں گے، یہ مدرسہ سراپا سوال ہے؟

صاحب علم و دانش کہلانے والے مسلمانوں کے برسر اقتدار اور لیڈر حضرات کو نصف صدی ہونے کو آئی ہے کہ وہ مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے اقوام متحدہ کے دروازے

پر انصاف کی بھیک مانگتے رہے، فلسطین کو لینے کے لیے کاسۂ گدائی پھیلاتے رہے، کشمیر کے لیے اسی طریق کار پر عمل پیرا رہے، مگر انھیں کچھ بھی تو نہ ملا۔ افغانیوں نے یہ کام کیا کہ جہاد کے راستے پر چل کھڑے ہوئے اور پھر دنیا بھر کے مجاہد اور مخلص مسلمان ان کے ہم رکاب ہوگئے......اور پھر افغانستان کا مسئلہ ایسا حل ہوا کہ اس کے ساتھ ازبکستان، ترکمانستان، قازقستان، کرغستان، آذربائیجان اور چیچنیا کا مسئلہ بھی قدرے حل ہوگیا اور ابھی مزید مسائل حل ہونے والے ہیں اور (ان شاء اللہ) کوئی مسئلہ باقی نہیں رہے گا۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس راستے پر چلتے رہیں، وہ راستہ کہ تجربے نے ثابت کردیا کہ یہی عقل و دانش کا راستہ ہے اور یہ کہ اسے اپنانے والے صاحب خرد لوگ تھے، اولوالالباب تھے، مسلمانوں کو اپنے مسائل کے حل کے لیے ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے۔

مسجد میں مولویوں کی تصاویر:

اب ہم آستراخان کی مرکزی اور سب سے خوبصورت مسجد میں گئے تو اس کے اندرونی دروازے پر روس کے مفتیوں اور مولویوں کی تصاویر ایک فریم میں لٹکائی ہوئی تھیں...... یہ تصاویر دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی اور اس سے بڑھ کر یہ حیرانی کہ سب نے کوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے ساتھ نائی لگا رکھی تھی جو کہ صلیب کا نشان ہے اور ہر عیسائی اسے گلے میں خوب کس کر ڈالتا ہے۔ یہ صاحب تصویر حضرات داڑھی منڈے تھے، چند ایک کی تھی اور وہ بھی انتہائی چھوٹی ......معلوم ہوا کہ روسیوں نے یہ مولوی اور مفتی خاص طور پر رکھے ہوئے تھے اور یہ مولوی بھی کمیونسٹ ہی ہیں جیسا کہ ماسکو کے امام صاحب کا تجربہ ہوچکا تھا...... مجھے بتایا گیا کہ آستراخان میں ایسے بھی مولوی صاحب ہیں کہ جمعہ کے دن لوگوں نے اسے کہا کہ جمعہ پڑھائیں تو وہ گھر میں ہونے کے باوجود مسجد میں نہ آئے اور کہا وہ چھٹی پر ہیں، لوگوں نے کافی کہا مگر وہ نہ مانے اور کہا کہ جب میں نے اس روز کی حکومت سے چھٹی لے لی ہے تو اب آخر میں کیوں مسجد میں جاؤں؟

مزید معلوم ہوا کہ جو مسجدیں واگزار ہو رہی ہیں ان میں ایسے ہی مولوی اور امام ہیں

جوکہ روس کے حامی ہیں اور یہ مسجدیں حکومت کے تحت ہیں اور مزید ظلم کی بات یہ ہے کہ ان مسجدوں کی مرمت وغیرہ پر تو پیسا عام مسلمان لگا رہے ہیں جبکہ مسلمانوں کو ان مسجدوں کا ٹیکس بھی حکومت کو دینا ہوتا ہے اور یہ ٹیکس روسی حکمرانوں نے لگا رکھا ہے۔

یہ حال تھا مسجدوں کا جبکہ آستراخان کا کریملن جوکہ شہر کے وسط میں کئی مربع اراضی میں ہے، اس میں عالی شان گرجے موجود تھے، ان کے میناروں پر سونے کی صلیبیں چمک رہی تھیں، آستراخان کا کریملن روسی سربراہ کے کنٹرول میں ہے اور روسیوں نے اسے براہ راست روس میں شامل کر رکھا ہے اور تاتارستان وہ صرف قازان اور اس کے نواحی علاقوں کو ہی کہتے ہیں اور وہ بھی روس میں شامل ہے۔ آستراخان کی اہمیت اس لحاظ سے بھی بہت زیادہ ہے کہ یہاں آکر وولگا بحر قزوین میں گرتا ہے، جسے بحر خزر بھی کہتے ہیں۔ تو یوں آستراخان دریائے وولگا اور بحر قزوین کے کنارے آباد مسلمانوں کا ایک تاریخی شہر ہے کہ جس کے ایک جانب ترکستان اور دوسری جانب قفقاس کے ممالک ہیں۔

روسی نومسلم عبدالفتاح سے ملاقات:

بھائی محمد صاحب جوکہ عالم دین ہیں، عربی بڑی اچھی اور روانی سے بولتے ہیں، انفرادی طور پر اپنے گھر میں ہی نوجوانوں کو پڑھاتے ہیں۔ عصر کے وقت پانچ چھ نوجوان اکٹھے ہوگئے، ان میں ایک قازق تھا، ایک تاتاری اور ایک داغستانی تھا...... روسی نومسلم ابھی نہیں آیا تھا، سو وہ بھی آگیا...... محمد صاحب نے مجھے بتلایا کہ یہ ہمارے روسی بھائی ہیں، ان کا نام عبدالفتاح ہے۔ ۲۲،۲۳ سال عمر، پوری داڑھی، لمبے قد کے خوبصورت نوجوان ہیں، دسترخوان پر بیٹھے ہم کھانا کھا رہے تھے کہ ہمارا یہ بھائی چمچے اور کانٹے کو ایک طرف رکھ کر دائیں ہاتھ سے سویاں کھانے لگا، سنت سے تو اسے کمال درجے کی محبت تھی۔ یہ نوجوان جو ''ایلک'' سے عبدالفتاح بن چکا ہے، میں نے اس سے پوچھا اسلام نے آپ کو کیسے فتح کیا؟ وہ کہنے لگا میرے ذہن میں اکثر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ آخر اس دنیا میں میرا مقام کیا ہے؟ میرا مستقبل کیا ہے؟ میں کہاں سے آیا ہوں، کہاں جاؤں گا اور یہ کہ مجھے کیوں اور کس مقصد کے لیے اس

جہان میں پیدا کیا گیا اور یہ کہ مجھے اور اس جہاں کو پیدا کرنے والا میرا حقیقی خالق کون ہے؟ مجھے ان سوالات نے پریشان کر رکھا تھا اور میں ان کا کہیں بھی جواب نہیں پا رہا تھا، آخر کار میرے ہاتھ قرآن لگ گیا روسی زبان میں اس کا ترجمہ ایک یہودی مستشرق کراچ کوسکی نے کیا ہے، بس یہ قرآن پڑھنے سے میرے تمام سوالات کے جوابات مجھے مل گئے، قرآن نے مجھے فتح کر لیا تھا اور میں بحمدللہ عبدالفتاح بن گیا۔ میرا اگلا سوال تھا قرآن کی کون سی سورت آپ کے اسلام کا باعث بنی اور اس نے آپ کو زیادہ متاثر کیا؟ تو عبدالفتاح کہنے لگا ویسے تو تیسویں پارے کی سورتوں نے میرے دل کو ہلا ڈالا تاہم میرے اسلام کا باعث سب سے زیادہ جو سورت بنی وہ سورۂ نجم ہے۔

عبدالفتاح کہنے لگے مجھے اللہ تعالیٰ نے غور و فکر کی نعمت سے نوازا ہے اور یہی میرے لیے قبول حقیقت کا باعث بن گئی اور اسلام جو سراسر حق اور حقیقت پر مبنی ہے اس سے ہدایت وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں، اللہ کا بے پناہ شکر ہے کہ اس نے مجھے ہدایت سے نوازا۔

میرا آخری سوال تھا کہ آپ کے ماں باپ اور دیگر لوگ آپ کے لیے رکاوٹ تو بنے ہوں گے؟ انھوں نے کہا رکاوٹ تو بنے تھے، ظاہر ہے انھوں نے بننا تھا مگر جب انھوں نے میری ثابت قدمی دیکھی اور میرے دلائل کی قوت کے سامنے اپنی بے بسی ملاحظہ کی تو اب وہ خاموش ہو گئے ہیں۔

عبدالفتاح عربی زبان بولنے کی بھی کچھ استطاعت رکھتے ہیں، تاہم وہ بھائی محمد سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

اب نماز کا وقت ہو گیا تھا، عبدالفتاح سنتیں پڑھنے میں مصروف ہو گیا، بخاری و مسلم کے مطابق رفع الیدین اور خشوع و خضوع اس کا دیدنی تھا۔ تین دن ہم اپنے ان بھائیوں کے پاس رہے، جمعہ بھی یہاں ادا کیا، چالیس کے قریب نوجوان تھے جو کتاب و سنت کے حامل اور صحیح العقیدہ مسلمان تھے.....یہاں اپنے ان بھائیوں سے فارغ ہوئے تو اب ہماری اگلے سفر

کے لیے تیاری تھی، گھر سے نکل کر سڑک پر آئے تو روسی لڑکیاں معروف عریاں لباس میں جا رہی تھیں، عبدالفتاح کی نظر پڑی تو فوراً دوسری طرف گھومے، نگاہ کو پلٹا اور نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اف یہ کفار..... کہ ان کی غلاظت سے کب جان چھوٹے گی۔ عربی میں یہ جملے عبدالفتاح کی زبان سے بڑے ہی پیارے لگ رہے تھے، اب ہم دونوں بھائی بغلگیر ہوئے کہ اللہ کو منظور ہوا تو دوبارہ (ان شاء اللہ) ملاقات ہوگی اور پھر آستراخان کے سٹیشن کی طرف چل دیے، جسم تو الگ الگ ہو گئے مگر عقیدہ و ایمان کی بنیاد پر ہمارے دل ایک تھے جو اللہ کے فضل سے دنیا بھر کے مسلمانوں کے ایک ہیں، ستر سالہ الحاد کا پردہ انھیں چاک نہیں کر سکا۔ کیسا بابرکت ثابت ہوا ہے افغانستان کا جہاد کہ جس نے آج وصل کا یہ موقع بھی دیکھنے کو دیا..... (الحمدللہ)

کوہ قاف کی طرف امام شامل کے دیس داغستان میں

چیچنیا میں چودہ گھنٹے:

رات ساڑھے سات بجے ریل گاڑی پر آستر اخان سے روانہ ہوئے اور جنگلات کا سفر طے کرتے ہوئے صبح سات بجے چیچنیا کے سٹیشن ''گوورمیس'' پر پہنچے۔ چیچن اور انگیشیا دراصل شمالی قفقاز کی دو ریاستوں کے نام ہیں، چیچن اور انگیشیا دونوں قبیلوں کے نام پر ان ریاستوں کو ایک ہی کر دیا گیا ہے۔ عربی میں اس ریاست کو ''شاشان الغوش'' کہتے ہیں......اب ہم اس علاقے میں داخل ہوگئے ہیں جو ہماری پاکستانی کہانیوں میں پریوں کا علاقہ کہلاتا ہے اور اگر انتہائی دوری، بُعد اور راستوں کے اعتبار سے مشکل علاقہ کا ذکر کرنا ہو تو کوہ قاف کا نام لیا جاتا ہے۔ کوہ قاف قو قاز، قفقاز اور قفقاس دراصل ایک ہی علاقے کے مختلف نام ہیں جو کہ بحر قزوین اور بحر اسود کے درمیان ہے یہ وہ علاقہ ہے کہ جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلام کا پیغام پہنچ گیا تھا......روسی بادشاہوں نے جب اس علاقے پر قبضہ کرنا چاہا تو شیخ محمد شامل رحمہ اللہ نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں ۲۵ سال تک جہاد کیا، شاشانیوں نے شیخ کا بھرپور ساتھ دیا۔ بعد میں جب کمیونسٹوں نے اس علاقے پر قبضہ کیا تو انھوں نے سٹالن کے دور میں شاشانیوں کا خوب قتل عام کیا اور جہاد میں شیخ شامل رحمہ اللہ کا ساتھ دینے کے جرم میں ان کی بہت بڑی تعداد کو سائبیریا میں پھینک دیا۔ چیچن الغوش کا شہر گوورمیس جو کہ درمیانے درجے کا شہر ہے، ہم نے اس شہر کی مرکزی مسجد میں ظہر

کی نماز ادا کی، مسجد میں بیس کے قریب نمازی تھے، نماز کے بعد تعارف ہوا لوگ بڑی محبت سے ملے، امام مسجد جن کا نام محمود تھا انھوں نے کھانے کی دعوت دی مگر ہمارے کھانے کی مہر سلطان کے دانا پانی پر لگی ہوئی تھی۔ لہٰذا ہم ان کے گھر پہنچ گئے، سب گھر والوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا کہ ہمارے گھر وہ شخص مہمان ہے جو کہ پاکستانی ہے، عربی بولتا ہے اور افغانستان میں جہاد کرتا رہا ہے۔ جب ہم دسترخوان پر بیٹھے تو کھانے میں کچھ دیر تھی، لہٰذا ستر سال سے قرآن کا چہرہ نہ دیکھنے والوں نے اب مجھ سے مطالبہ کیا کہ ہمیں قرآن سناؤ۔ اب صورتحال یہ تھی کہ میں قرآن کی تلاوت کررہا تھا اور سب گھر والے محبت و مسرت سے سن رہے تھے۔ ستر سال تک نہ انھیں کسی نے قرآن دیکھنے دیا، نہ سننے دیا، نہ پڑھنے دیا، نہ باہر کے مسلمان بھائیوں سے رابطہ کرنے دیا اور اب جہاد کی ضربوں نے ان پر پابندیوں اور کمیونزم کی زنجیروں کو توڑا ہے تو صورتحال یہ ہے کہ دین کے ان پیاسوں کو کوئی پانی پلانے والا نہیں، مسجد کا امام اس لیے امام ہے کہ اسے دو چار سورتیں آتی ہیں اور بس۔

سلطان صاحب نے مجھے بتلایا کہ سٹالن کے دور میں روسیوں نے یہاں کے مسلمانوں سے ٹرین کو بھرا، کسی اور جگہ پھینک دیا اور دوسری جگہوں سے مسلمانوں کو اٹھایا اور یہاں پھینک دیا۔ انھوں نے کہا کہ کرغستان سے ہمیں گاڑی میں مویشیوں کی طرح بھرا گیا اور نو دن ہم گاڑی ہی میں رہے۔ اس دوران جو مرجاتا اسے گاڑی سے اس کے پیاروں کے سامنے اس طرح باہر پھینک دیا جاتا جس طرح کسی جانور کو مرنے پر پھینک دیا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا یہاں چیچنیا میں علماء بڑی تعداد میں تھے، ان ظالموں نے سب کو قطار میں کھڑا کر کے قتل کردیا۔ شہر کی مسجد جو کہ بڑی خوبصورت مسجد تھی انھوں نے بتلایا کہ یہ چند سال قبل ہی بنائی گئی ہے، جمعہ کے دن یہاں ڈیڑھ ہزار نمازی ہوتے ہیں۔ انھوں نے مزید بتلایا کہ اب ہمارے نوجوان ابخازیا میں جہاد کے لیے بھی جارہے ہیں کیونکہ قفقاز میں جارجیا کے عیسائی صدر گمسا خوردیا نے بحر اسود کے کنارے چھوٹی سی مسلمان ریاست پر چڑھائی کردی

ہے، جب ہم نے آزادی حاصل کی تو ابخازیا کے مسلمان ہماری مدد کو آئے تھے اور پھر چیچنیا کے لوگوں نے ہتھیار اٹھا لیے تھے اور روسیوں سے کہا کہ اگر تم ہمیں آزادی نہیں دو گے تو جہاد شروع کر دیں گے، لہٰذا ہم نے آزادی حاصل کی تو اب ہمارے لوگوں پر بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کریں اور یہاں کے سب علاقوں کے مسلمانوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ عیسائیوں کے خلاف آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

شاشان کا دارالحکومت گروزنی ہے، گروزنی روسی بادشاہ تھا جس نے یہ شہر آباد کیا، یہاں روسیوں کی اکثریت ہے، عمومی طور پر اس ریاست میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یہ ریاست اب آزاد ہے، شافعی المسلک لوگوں کی کثیر تعداد ہے۔ شاشان کے صدر ''جوہر داؤد'' مسلمان ہے، اس نے قرآن پر حلف اٹھایا تھا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرے گا۔ ۱۹۹۲ء کے شروع میں اس ریاست نے آزادی حاصل کی ہے۔

داغستان:

''داغستان'' ترکی اور فارسی زبان کا مرکب ہے، جس کا معنیٰ ''پہاڑی علاقہ'' ہے۔ شیخ شامل رحمہ اللہ اسی داغستان کے باشندے تھے۔ آستراخان میں مجھے شیخ بہاؤالدین کے پاس پہنچنا تھا، لہٰذا ہم دونوں ساتھی ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ریل کے ذریعے ''کزیلی یورتھ'' میں تھے، شیخ کے گھر پہنچے مگر وہ موجود نہیں تھے، وہ دعوت کے لیے دوردراز علاقوں کے سفر کے لیے ایک روز قبل گھر سے نکلے تھے۔ شیخ کے دو بیٹے بارہ سالہ ہارون اور اس سے چھوٹا موسیٰ آئے، ان کی والدہ بھی آگئیں، گھر بٹھایا، شیخ کا کتب خانہ دیکھا۔ یہ تھا تو چھوٹا سا ہی مگر اس علاقے میں یہ بہت بڑا تھا، شیخ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابوں کے یہاں کئی مسودے پڑے تھے۔ علم نحو پر انھوں نے کتاب لکھی، اس کی فوٹو سٹیٹ کروا کر ۲۵۔۳۰ جلدیں تیار کر کے رکھی ہوئی تھیں۔ یہ کتابیں شیخ اپنے شاگردوں کو پڑھاتے ہیں۔ روسی زبان میں ترجمے کے ساتھ انھوں نے نماز کے لیے اب ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے، یہ چھپ چکی ہے۔ ہارون نے

اس کا ایک نسخہ مجھے دیا۔عربی میں دعائیں پڑھ کر پتا چلا کہ اس میں نماز کا طریقہ اسی طرح لکھا ہے جس طرح اللہ کے رسول ﷺ نماز پڑھا کرتے تھے اور وہ طریقہ امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔

شیخ بہاؤ الدین جن کی عمر ۴۵ سال ہے اور وہ آستراخان کے نوجوان عالم محمد کے بھی استاد ہیں، انھوں نے کمیونزم کے دور جبر وتشدد میں یہ علم کہاں سے اور کس سے حاصل کیا؟ جبکہ کمیونسٹوں نے علماء کی کثیر تعداد کو قتل کردیا، کتب خانے، مدرسے اور مسجدیں ڈھا دیں اور دین حاصل کرنا گردن زدنی جرم تھا۔شیخ کے گھر والوں نے بتلایا کہ انھوں نے اپنے باپ سے علم حاصل کیا، وہ امام مسجد تھے اور عالم تھے، گھر میں ہی باپ نے اپنے بیٹے کو اپنا علم منتقل کردیا پھر بیٹے نے مطالعے اور جستجو سے اس قدر حاصل کیا کہ وہ باپ سے بھی آگے نکل گئے۔

شیخ کے گھر کھانا کھایا، ان کے نام خط لکھا اور پھر موسیٰ اور ہارون کو ان کی والدہ نے ہمارے ساتھ بھیج دیا اور ہم شیخ کے مدرسے میں آگئے۔

مدرسۃ الحکمہ میں استاد اور شاگردوں سے ملاقات:

چھ سات ایکڑ میں پھیلا ہوا یہ مدرسہ کہ جس کی عظیم الشان دومنزلہ عمارت کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، اس کے بارے میں طلباء نے بتلایا کہ یہ پہلے نرسری سکول تھا، حکومت نے اسے بیچنا چاہا تو شیخ نے اسے خریدنے کے لیے کوششیں شروع کردیں، ہمارے مخالفین جو کہ ہمیں کتاب وسنت کا متبع ہونے کی بناء پر وہابی کے نام سے مطعون کرتے ہیں، انھوں نے بڑی مخالفت کی۔اب حکومت نے ان سے کہا کہ تم اس کی رقم دے دو ہم تمھیں دے دیتے ہیں اور حکومت بھی انھیں ہی دینا چاہتی تھی مگر ہم نے بھاگ دوڑ کرکے اللہ کی توفیق سے پیسے اکٹھے کرلیے، لہٰذا حکومت کو ہمیں ہی یہ مدرسہ دینا پڑا۔ اب سودا طے ہونے کے بعد پھر حکومت پر دباؤ پڑا تو اس نے لیت ولعل سے کام لینا شروع کردیا مگر ادھر ہم بھی خاموش بیٹھنے والے نہ تھے لہٰذا اللہ نے مدد کی اور یہ مدرسہ ہمیں مل گیا اور یہاں ڈیڑھ صد کے قریب طلباء زیر تعلیم

ہیں، آدھے چیچن سے ہیں اور آدھے داغستان سے، آذربائیجان سے بھی ہیں اور تازان کا ایک طالب علم بھی یہاں موجود تھا۔

مدرسے میں ان دنوں چھٹیاں تھیں مگر اس کے باوجود سات آٹھ کے قریب طلباء یہاں موجود تھے، ان طلباء نے جو محبت بھرا سلوک ہمارے ساتھ کیا وہ کبھی نہیں بھولے گا۔ طلباء نے بتلایا کہ قفقاز کے سارے علاقوں کی نسبت چیچنیا اور داغستان میں اسلامی بیداری کی لہر زیادہ ہے جبکہ ان دونوں میں پہلے نمبر پر داغستان ہے۔ مدرسہ جس کو شروع ہوئے چھ ماہ ہوئے ہیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ طلباء عربی میں گفتگو کر لیتے تھے۔

اس مدرسے میں کل تین اساتذہ ہیں، ایک تو شیخ بہاؤالدین خود ہیں جن کی نگرانی میں یہ مدرسہ تعلیم اور دعوت کا مرکز ہے، دوسرے مصر سے جامعۃ الازہر کے فارغ شیخ سعد مصری ہیں۔ دو طالب علموں نے شیخ کو ان کے گھر جا کر ہمارے آنے کی اطلاع دی، وہ فوراً مدرسے میں تشریف لے آئے، انھوں نے کہا یہ سارا علاقہ دین کا پیاسا ہے مگر علماء اور داعیوں کی کمی ہے، انھوں نے کہا اللہ نے مجھے توفیق دی یہاں خدمت بجالا رہا ہوں۔ انھوں نے کہا لڑکیاں تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہیں مگر فی الحال کوئی بندوبست نہیں جبکہ مدرسۃ البنات کی اشد ضرورت ہے۔ تیسرے استاد عبدالرب صاحب ہیں جن سے لوگ مسائل دریافت کرتے ہیں یعنی افتاء کا کام ان کے حوالے ہے۔

شیخ نے اب ۴۰ کلومیٹر دور ایک گاؤں میں دعوت کے سلسلے میں جانا تھا، مجھ سے رخصت ہوئے اور انھوں نے بتلایا کہ ہم اسی طرح چھٹیوں میں اور تدریس کے دوران فارغ اوقات میں دیہات وغیرہ کے اندر دعوت میں مصروف ہوجاتے ہیں اور یہ ہمارے شاگرد ترجمان کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔

آذربائیجان میں دل آزار لمحات:

رات گیارہ بجے مدرسے کے طلباء نے ہمیں گاڑی میں بٹھا کر الوداع کیا، گھنٹہ بھر چلنے

کے بعد داغستان کا دارالحکومت ''مچ قلعہ'' آ گیا، بحرقزوین کے کنارے یہ شہر آباد ہے اور ہمارا سفر بھی بحرقزوین کے کنارے کنارے ہی ہے کہ دائیں طرف پہاڑ ہیں اور بائیں طرف بحرقزوین۔ گیارہ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم آذربائیجان کے دارالحکومت ''باکو'' شہر میں تھے۔ باکو بحرقزوین کے کنارے جزیرہ نما شہر ہے۔

ہم سٹیشن سے سیدھے بندرگاہ پر پہنچے، ہمارا پروگرام یہ تھا کہ باکو سے بحری جہاز کے ذریعے ترکمانستان اور وہاں سے ازبکستان چلے جائیں گے، یہ مختصر راستہ تھا مگر یہ ہمیں بہت مہنگا پڑا۔ بندرگاہ سے پتا چلا کہ جہاز آج جائے گا یا کل، یہ اطلاع پانچ بجے ملے گی۔ اب ہمارے پاس سات آٹھ گھنٹے تھے، لہٰذا ہم مسجد کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، بحرقزوین کے کنارے گھنے درختوں والے پارکوں کا منظر بڑا خوبصورت تھا، ایوان صدر ہمارے بائیں جانب تھا اور ہم مرکزی سڑک پر لوگوں سے مسجد کا پتا پوچھ رہے تھے، سڑک کے کنارے پولیس کی گاڑی کھڑی تھی، گزرتے ہوئے بھائی فتح اللہ نے پولیس اہلکار سے مسجد کا پتا پوچھ لیا، اس نے کہا تم کہاں سے آئے ہو اور پھر سوالات کی بوچھاڑ شروع ہوگئی جبکہ فتح اللہ کے پاس اسے دکھانے کے لیے نہ کوئی پاسپورٹ تھا اور نہ ہی شناختی کارڈ تھا۔ اب ان تین چار پولیس والوں نے ہمیں گاڑی کے اندر بٹھا لیا اور میرے کاغذات چیک کرنے شروع کر دیے جبکہ میرا ویزا تو فقط ازبکستان کا تھا اور وہاں بھی فقط تین شہروں تاشقند، سمرقند اور بخارا کے لیے اور پھر اس ویزے کی مدت ختم ہوئے بھی آج چار دن ہو چکے تھے، لہٰذا اب فتح اللہ جیل میں جائے گا اور امیر حمزہ پاکستان کے سفارت خانے میں۔ اب گاڑی چل چکی تھی، شہر میں گھومتی رہی اور وہ ہم سے باتوں میں مصروف رہے۔ کچھ دیر بعد وہ کہنے لگے کہ امیر حمزہ آزاد ہے، یہ جا سکتا ہے مگر فتح اللہ نہیں جا سکتا، یہ تو جیل جائے گا۔ میں نے کہا میں اپنے ساتھی کو چھوڑ کر کیسے جاؤں، یہ نہیں ہوسکتا اور فتح اللہ نے انھیں کہا کہ دیکھو...... یہ مسلمانوں کے حالات معلوم کرنے یہاں آئے ہیں اور تم یہ سلوک کر رہے ہو۔ تو پھر اچھا تم ہمارے ساتھ کچھ بھی نہیں

کر سکتے الا یہ کہ ہمارا اللہ جو چاہے۔ اس کے بعد انھوں نے ہمیں چھوڑ دیا مگر حسب عادت کہ جو پولیس کی ہوا کرتی ہے یعنی ہمارا سامان دیکھ کر ہم سے جو لوٹنا چاہا انھوں نے لوٹ لیا۔

پولیس کی گاڑی میں کرب آمیز لمحات میں ہم نے اپنے اللہ سے دعائیں کیں اور اس مالک نے ہمیں ان سے نجات دی، اب ہم نے پھر مسجد کی تلاش شروع کر دی، ایک ٹیکسی والے سے کہا کہ وہ ہمیں مسجد میں لے چلے۔ وہ ایک جگہ ہمیں لے کر پہنچا اور ہم مسجد میں داخل ہوئے تو وہ شیعہ حضرات کی امام بارگاہ تھی، شرک کے وہاں مناظر تھے، فتح اللہ نے یہ سارا کچھ زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا، وہ گھبرا اٹھا، کہنے لگا یہ کیسی مسجد ہے اور یہ کون لوگ ہیں؟ چنانچہ ہم یہاں سے تو باہر نکل آئے جبکہ فتح اللہ کو مجھے اچھا خاصا لیکچر دینا پڑا۔.... باکو شہر میں اب ہم نے مسجد کی تلاش تو چھوڑ دی کیونکہ جگہ جگہ پولیس اور زبردست تفتیش جاری تھی، شاید یہ اس قدر آذربائیجان کی آرمیپا کے ساتھ جنگ کی وجہ سے تھی۔ کیونکہ ایک آذربائیجانی عورت نے ہمیں بتلایا کہ حال ہی میں چار سو آذربائیجانی قتل ہو گئے ہیں اور یہ کہ مزید نوجوان بھرتی کیے جا رہے ہیں، جنگ تیز ہو رہی ہے۔ آذربائیجان میں اکثریت شیعہ حضرات کی ہے، دیہات میں اہل سنت کافی تعداد میں ہیں۔ باکو میں سنا تھا کہ ایک مسجد ہے مگر تلاش کرنے میں ہم تو ناکام رہے پھر جو پانچ بجے بندرگاہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ آج جہاز نہیں جائے گا، اب ہمیں فکر دامنگیر ہوا کہ کل تک انتظار تو تب کریں جب ہمیں ٹکٹ مل جائے اور جب اس کا پتا کیا تو معلوم ہوا کہ پاسپورٹ اور ویزے کے بغیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لہٰذا اب ہم یہاں سے سٹیشن کی طرف بھاگے، وہاں سے گاڑی پکڑی اور ۳۶ گھنٹوں کا سفر کرنے کے بعد دوبارہ آستراخان پہنچے۔

قازقستان، ترکمانستان، بخارا اور سمر قند کی قلم بند یادیں

آسترا خان میں دوبارہ بھائی محمد کے پاس کچھ وقت گزارا اور پھر ۲۲ اگست کو ایک بجے ریلوے سٹیشن پر پہنچے۔ آسترا خان سے تاشقند کے لیے روزانہ ایک ہی ٹرین جاتی ہے اور یہ ڈاک ٹرین ہے جو کہ تین دن میں تاشقند پہنچتی ہے، ٹرین کی بوگیاں بھی پانچ چھ سے زائد نہیں ہوتیں، بسیار کوشش کے باوجود ہمیں اس کا ٹکٹ نہ مل سکا، تھک ہار کر ٹرین کے پاس کھڑے تھے کہ بھائی محمد نے ڈاک کے ایک آفیسر سے بات کی۔۔۔ باتوں باتوں میں یہ آفیسر ازبکستان کے شہر ''اند جان'' کا باسی نکلا، تب میرے ہم سفر ساتھی کی اس حوالے سے اس سے آشنائی ہوگی کہ فتح اللہ تو ''اند جان'' میں زیر تعلیم ہے اور جس توحید سے منور مدرسے میں وہ زیر تعلیم ہے، ڈاک کا آفیسر اسی مدرسے کی مسجد کا نمازی ہے۔ اب جب میرا تعارف کرایا گیا تو ڈاک کے اس آفیسر نے اپنی بوگی میں سپیشل کیبن ہمارے لیے مخصوص کر دیا۔ یہ خالص اللہ کا کرم تھا جو ہم پر ہوا کہ دوران سفر یہ لوگ کھانا تیار کرتے اور جب دستر خوان پر سجا لیتے تو ہمیں بلا لیتے۔ ۲۲ اگست کا دن گاڑی میں یوں گزرا کہ آسترا خان سے ایک بجے چلے، تقریباً آدھ گھنٹہ بعد ''قازقستان'' کا بے آب وگیاہ جنگل شروع ہوگیا، کبھی چھوٹی موٹی جھاڑیاں شروع ہو جاتیں اور کبھی ریگستان میں گاڑی دوڑ رہی ہوتی۔ اب رات بھی بیت چکی تھی، فجر کی نماز کے بعد دستر خوان پر بیٹھ چکے تھے۔ میں نے ڈاک آفیسر سے کہا کہ چونکہ یہ گاڑی بخارا اور سمر قند سے ہو کر تاشقند جائے گی اور بجائے اس کے کہ میں تاشقند سے دوبارہ واپس ان شہروں میں آؤں، کیوں نہ بخارا ہی میں اتر جاؤں۔ اس پر ڈاک آفیسر نے ہمیں

مشورہ دیا کہ ایک گھنٹے کے بعد قازقستان کا شہر ''بی نیو'' آ رہا ہے، آپ یہاں اتر جائیں، چار گھنٹے یہاں گھومیں پھیریں اور آرام کریں اور پھر ماسکو سے ایکسپریس ٹرین آئے گی اس میں سوار ہو جائیں اور اگلے دن صبح بخارا پہنچ جائیں، سارا دن شہر دیکھیں تب تلک شام کو ہماری گاڑی بھی بخارا کے سٹیشن پر ہوگی۔ اب آپ ہمارے ساتھ پھر سے سوار ہو جائیں اور اگلے روز صبح کے وقت سمرقند اتر جائیں ۔۔۔ بڑی زبردست تجویز تھی۔ چنانچہ ہم ۲۳ اگست کو صبح سات بجے قازقستان کے شہر ''بی نیو'' میں اتر گئے۔

جب ہم ''بی نیو'' میں امام مسجد کے مہمان بنے:

سٹیشن سے باہر نکلے ...... یہاں قدرے سردی تھی، سورج کی شعائیں بڑی اچھی لگ رہی تھیں۔ اس شہر میں ہم نے مسجد کا پوچھا تو پتا چلا کہ مسجد کوئی نہیں ہے۔ امام مسجد کا معلوم کیا تو پتا چلا کہ امام مسجد موجود ہے۔ چنانچہ تلاش کرتے کرتے بالآخر آدھ گھنٹے بعد ہم امام مسجد کے گھر کے دروازے پر تھے۔

دروازے پر دستک دی تو ایک شخص باہر نکلا، بڑے تپاک سے ملا، مختصر سا تعارف ہوا تو اس نے اندر آنے کو کہا۔ میں نے سوچا امام مسجد اندر رہوں گے جبکہ یہ شخص تو کسی ورکشاپ کا مکینک ہے مگر یہ مکینک ہی دراصل امام مسجد تھا۔ وہ اپنی جیپ درست کر رہا تھا، اب ہمیں بٹھا کر اس نے اپنے آپ کو درست کیا، جبہ و دستار پہنی۔ دسترخوان سج گیا اور گفتگو کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ امام صاحب عربی جانتے تھے نہ سمجھ سکتے تھے، بس سادہ قرآن پڑھے ہوئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی چند سورتیں یاد تھیں اور اسی تعلیم کی برکت سے وہ اس شہر کے امام مسجد تھے، وہ تعلیم کہ جو چھپ کر انھوں نے اپنے باپ سے حاصل کی تھی...... اب امام صاحب نے اپنی کتابوں کا خزانہ کہ جسے انھوں نے اور ان کے باپ نے بڑا چھپا کر رکھا ہوا تھا وہ سارا خزانہ میرے سامنے لاکر رکھ دیا۔ یہ ترکی کی چھپی ہوئی حنفی مسلک کی کتابیں تھیں، عربی میں بھی تھیں اور ترکی زبان میں بھی۔ امام صاحب عربی کتابیں تو نہ پڑھ سکتے تھے جبکہ ترکی کتابوں سے

استفادہ کرتے تھے۔ اب جو میں نے ان بوسیدہ کتابوں کو دیکھنا شروع کیا تو ان میں نہ صرف یہ کہ کتاب وسنت کی مخالفت اور مقلدانہ باتوں کی بھرمار تھی بلکہ یہ شرک وبدعت سے بھی لبریز تھیں......اب تو میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا......یا اللہ! ان لوگوں نے اس قدر خوف و دہشت کی حالت میں بھی دین کے نام پر یہ خزانہ سنبھال کر رکھا......مگر یہ تو وہ خزانہ ہے جو ان پر روسی ملحدانہ آفتوں کا سبب بنا ہے۔انھوں نے سنبھال کر رکھا بھی تو آخر کیا سنبھال کر رکھا، ستر سال قبل جس زنگ آلود لوہے کو انھوں نے سونا سمجھ کر سنبھال کے رکھا یہ آج بھی اسے سونا ہی خیال کیے ہوئے ہیں۔ میں غم والم کی تصویر بنے یہ سوچ چلا جا رہا تھا کہ امام مسجد نے ایک کتاب کھولی اور اس کے صفحے پر بنا ہوا ایک ''لواء الحمد'' مجھے دکھلایا اور مجھ سے کہنے لگے کہ ہماری جو مسجد زیر تعمیر ہے اس میں یہ لواء الحمد لٹکانا چاہتا ہوں، اسے خوبصورت طریقے سے چھپوانے کا پروگرام ہے۔ امام مسجد جب خوشی کے ساتھ مجھے بتلا چکا تو میں نے کہا یہ تو ٹھیک ہے کہ قیامت کے روز اللہ کے رسول ﷺ کے ہاتھ میں ''لواء الحمد'' یعنی حمد کا جھنڈا ہوگا مگر وہ کس طرح کا ہوگا، یہ قرآن وحدیث سے ثابت نہیں......اور اب یہ جو اس کتاب میں جھنڈا بنا ہوا ہے اس کے چار کونوں پر خلفائے اربعہ کے اسمائے گرامی ہیں، درمیان میں کلمۂ شہادت ہے تو یہ اختراع اس کتاب کے لکھنے والے کی ہے، لہٰذا آپ ایسی باتوں کو اور ان کتابوں کو چھوڑ دیں، دین قرآن وحدیث کا نام ہے اور آپ دین وہیں سے حاصل کریں۔ بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی وغیرہ جو حدیث کی کتابیں ہیں ان کا مطالعہ کریں، حنفیت اور شرک وبدعت سے بچیں...... بہر حال میں نے تقریباً گھنٹہ بھر امام صاحب کو سمجھایا......بحمد للہ انھوں نے میری ہر بات کو تسلیم کیا اور اب کتابوں کو باندھ کر ایک طرف رکھ دیا اور کہا کہ اب میں حدیث کی ترجمے والے کتابوں کو ڈھونڈوں گا اور انھیں سے دین حاصل کر کے اس علاقے میں پھیلاؤں گا اور پھر آہ بھر کر انھوں نے کہا کہ ان کتابوں کا حصول فی الوقت مشکل ہے۔ بہر حال میں نے امام صاحب کو کچھ ساتھیوں کے پتے دیے اور کہا کہ اپنے علاقے میں آپ

ان سے رابطہ کریں، ان شاء اللہ آپ کی راہ نمائی بھی ہوگی اور اہل توحید علماء کا آپس میں تعلق بھی قائم ہوگا۔

امام صاحب کہ جن کا نام کیلس بائی تھا ہم ان کے دستر خوان سے اٹھے تو انھوں نے مجھے تازقستانی طربوش (ٹوپی) اور گائے کے گھی کا ایک ڈبہ تحفے میں دیا اور اب ہم مسجد کی طرف چل دیے۔مسجد ابھی زیر تعمیر تھی۔امام صاحب نے بتلایا کہ روسی انقلاب سے قبل یہاں کئی مساجد تھیں پھر ان میں سے ایک بھی باقی نہ رہی۔اب دو سال قبل ہم نے جمعہ کی نماز شروع کی ہے اور یہ میرے گھر میں ہی ہوتی ہے۔دو ہفتے بعد ہم ان شاء اللہ اپنی اس مسجد میں نماز شروع کر دیں گے...... میں نے امام صاحب سے کہا کہ یہ جو دو سال قبل آپ نے نماز اپنے گھر میں شروع کی اور اب مسجد بھی بن رہی ہے اور میں پاکستان سے یہاں آپ کے ہاں گفتگو کر رہا ہوں تو کیا آپ کو معلوم ہے یہ سب کچھ کیسے ممکن ہوا ہے۔کہنے لگے ہاں! روس افغانستان میں مجاہدین کے ہاتھوں شکست کھا گیا ہے۔اب میں نے امام صاحب کو کہا کہ جہاد افغانستان نے ''بی نیو'' میں اسلام پر جو دروازے بند تھے وہ وا کروا دیے ......تو اب آپ کا فرض ہے کہ توحید و جہاد کے انھیں زینوں کی طرف چڑھنا شروع کریں کہ جن کی کامیابی کا منظر آپ کو ''بی نیو'' میں بھی دکھائی دے رہا ہے۔

امام صاحب کی جیپ میں شہر کی سیر کرتے ہوئے اب ہم سٹیشن پر آئے، تھوڑی دیر بعد ماسکو سے آنے والی ٹرین آ گئی۔امام صاحب نے ٹرین کے بڑے آفیسر سے رابطہ قائم کیا، میرا تعارف کروایا اور پھر فسٹ کلاس میں دو آدمیوں کا آرام دہ کیبن ہمارے حوالے کر دیا گیا۔

دن کے بارہ بجے ہم ٹرین میں سوار ہوئے تھے۔آخر کار یہ دن بھی بیت گیا، رات بھی گزر گئی، گاڑی تازقستان میں ہی رواں تھی، جب صبح کے نو بج چکے تو اب ہم ترکمانستان میں تھے۔

ترکمانستان میں:

گاڑی ترکمانستان کے جس شہر میں رکی ہم نے یہاں اتر کر ناشتہ وغیرہ کیا، سور کا گوشت یہاں بھی فروخت ہو رہا تھا...... یہ وہی ترکمانستان ہے کہ جسے حضرت احنف بن قیس رضی اللہ عنہ نے فتح کیا تھا...... ابھی ہم بحیرۂ خوارزم کے قریب سے گزر کر دریائے جیحون (دریائے آمو) کے کنارے کنارے محوِ سفر تھے، یہ دریا افغانستان سے چلا آرہا تھا بحیرۂ خوارزم میں گر رہا تھا۔ بحیرۂ خوارزم کے قریب ہی خوارزم کا علاقہ اور خیوہ کا شہر ہے، انہی علاقوں کی نسبت سے یہاں خوارزم شاہی سلطنت وجود میں آئی .....مگر جب سلطانوں نے جہاد چھوڑ کر عیش وعشرت کو اپنایا تو چنگیز اور اس کے پوتے ہلاکو نے علاؤالدین خوارزم شاہ کی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی پھر روسیوں نے اس علاقے پر قبضہ کیا۔ ''نساء'' اسی ترکمانستان کا شہر ہے جو ایران کی سرحد پر واقع ہے، اس شہر کو امام احمد ابوعبدالرحمٰن نسائی کی پیدائش گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے ۔ یہ وہ امام ہیں کہ جن کی لکھی ہوئی حدیث کی کتاب ''نسائی شریف'' صحاح ستہ میں شامل ہے۔ امام نسائی امام بخاری کے شاگرد ہیں...... امام نسائی کے شہر کے ساتھ ''مرو'' کا شہر ہے جو مسلمانوں کی عظمتوں کا نشان ہے..... مسلمانوں کی عظمتوں کے نشانات کمیونسٹ انقلاب نے برباد کر دیے تھے۔ افغانستان کی طرف سے آنے والا دریائے آمو میرے ساتھ ساتھ بہہ رہا تھا، بحیرۂ خوارزم میں گر رہا تھا، مجھے تو یہ بڑا خوش دکھائی دے رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ میں اب پامیر کی چوٹیوں سے بحیرۂ خوارزم تک قدرے آزاد ہوں، دہریت کی فضا قدرے چھٹی ہے، ضیا پاشیوں کی ابھی ابتداء ہوئی ہے، تب تو نور اور پھیلے گا جب امام نسائی کی کتاب کا پھر سے چرچا ہوگا، قال اللہ وقال الرسول ﷺ کی صدائیں ترکمانستان میں پھر سے گونجیں گی۔ اس ملک کے دارالحکومت ''اشک آباد'' میں قرآن وحدیث سن کر اہل ترکمانستان کی اشکیں جب آنکھوں سے جاری ہوں گی تو قرآن کے الفاظ میں یہ کیفیت پیدا ہوگی:

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿٨٣﴾

(المائدۃ:۸۳)

''وہ لوگ جب اس کلام کو سنیں گے جو رسول ﷺ کی طرف نازل کیا گیا تو آپ دیکھیں گے کہ ان کی آنکھیں اشکوں سے ڈبڈبا جاتی ہیں اس وجہ سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا، وہ بول اٹھتے ہیں...... ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے، ہمیں گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔''

اب ہماری گاڑی ترکمانستان سے نکل کر ازبکستان میں داخل ہو چکی تھی، ہم ترکمانوں کے وطن کو الوداع کہہ رہے تھے۔وہ ترکان کہ جن کی کوکھ سے طغرل اور الپ ارسلان جیسے بادشاہوں نے جنم لیا۔اس خاندان نے سلاجقہ کے نام سے صدیوں تک حکومت کی، الپ ارسلان نے رومی عیسائیوں کے خلاف جہاد کیا،مصر کے فاطمی شیعہ خلفاء کی حکومت کو ختم کیا اور عباسی خلیفہ کے ساتھ اپنے رشتے کو مستحکم کیا۔

امام بخاری کے شہر میں:

۲۴ اگست کا دن اور ایک بجنے کو تھا کہ ہماری گاڑی بخارا کے ریلوے سٹیشن پر کھڑی ہوئی۔قازقستان میں قدرے سردی تھی،ترکمانستان میں اس سے کم اور بخارا میں قدرے گرمی کا احساس تھا......سٹیشن سے ہم نے ٹیکسی پکڑی اور بیس پچیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اب ہم اپنے امام کے شہر میں تھے۔میں نے ٹیکسی والے سے کہا کہ ہمیں اس پرانے بخارا میں لے چل کہ جہاں امام بخاری رحمہ اللہ رہا کرتے تھے۔تھوڑی دیر بعد ہم ٹیکسی سے اتر کر شہر کی گلیوں میں گھومتے ہوئے اس مسجد میں پہنچے جسے مسجد کلاں کہا جاتا ہے۔

جامع مسجد امام بخاری میں:

دریائے زرفشان کے کنارے آباد بخارا بڑا قدیم شہر ہے، یہ تقریباً دوہزار پانچ سو سال پرانا ہے۔مجاہدین اسلام کے یہاں فاتحانہ داخل ہونے سے قبل یہ آتش پرستوں کا شہر تھا، پھر خاندان بنی امیہ کے ابتدائی دور میں عساکر اسلام کے سپہ سالار قتیبہ بن مسلم اس شہر میں فاتحانہ شان سے داخل ہوئے اور اس جگہ آئے کہ جو آج مسجد کلاں کے نام سے معروف ہے۔تب یہ مجوسیوں کا آتش کدہ تھا، یہاں صدیوں سے آگ کا آلاؤ جل رہا تھا، اہل بخارا آگ کی پوجا میں مگن تھے مگر قتیبہ رحمہ اللہ نے آگ کے اس الاؤ کو ٹھنڈا کیا اور پھر یہ جگہ کہ جہاں آگ کے سامنے سجدہ ریزی ہوتی تھی ،آگ کے خالق کے سامنے سجدہ ریزی ہونے لگی۔قتیبہ بن مسلم رحمہ اللہ نے جب سے یہاں اپنی جبیں اپنے مالک کے حضور جھکائی تھی تب سے یہ مسجد تھی اور مسجد بھی کلاں تھی یعنی بڑی مسجد۔ہاں تو یہی وہ مسجد ہے کہ جس میں ننھے محمد کو اس کی ماں قرآن کی تعلیم کے لیے بھیجا کرتی تھی، ننھا محمد یتیم تھا، اس کا باپ اسماعیل فوت ہو چکا تھا، ماں سوت کات کات کر محمد کو پڑھاتی رہی۔محمد اب بڑا ہو چکا تھا، جس قدر انھوں نے بخارا میں تعلیم حاصل کرنا تھی وہ کرلی۔ اب وہ تعلیم کے لیے بغداد اور حجاز کو چل دیے۔مدینہ میں انھوں نے اس جگہ بیٹھ کر ''الجامع الصحیح ''لکھی جو جگہ مسجد نبوی میں نبی مکرم ﷺ کی زبان اقدس سے ''ریاض الجنۃ''یعنی جنت کے باغ کے نام سے موسوم ہے......امام بخاری کی یہ کتاب جو اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث پر مشتمل ہے ایسی معروف ہوئی کہ پوری امت نے اس پر اجماع کرلیا کہ قرآن کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب محمد بن اسماعیل بخاری کی لکھی ہوئی ''الجامع الصحیح '' ہے کہ جسے لوگ بخاری شریف کہتے ہیں......امام بخاری جب حجاز سے واپس بخارا آئے تو اسی مسجد کلاں میں بخاری شریف کا درس دینے لگے،تدریس کا کام کرنے لگے۔

ہاں......تو میں امام بخاری کی اسی مسجد میں کھڑا تھا، مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ میں واقعی

اپنے امام کی اس مسجد میں کھڑا ہوں جہاں قال اللہ وقال الرسول ﷺ کی صدائیں امام بخاری کی زبان سے اہل بخارا سنتے تھے، پھر وہ اس کے مطابق عمل پیرا ہوتے تھے۔

ہاں.....تو یہ مسجد رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کا منظر پیش کرتی تھی، آمین کے ساتھ اس کے در و دیوار گونج اٹھتے تھے..... بخارا میں نہ کوئی مزار تھا نہ قبہ۔تب بخارا توحید وسنت کا مرکز تھا، اس لیے کہ امام بخاری اس شہر میں صحیح بخاری پڑھایا کرتے تھے۔

امام بخاری کی جلاوطنی کے بعد بخارا پر اب تک کیا بیتی ؟:

امام بخاری ......بخاری پڑھا رہے تھے کہ امیر بخارا نے پیغام بھیجا کہ امام صاحب میرے بچوں یعنی شہزادگان بخارا کو محل میں آکر بخاری پڑھایا کریں۔امام صاحب نے کہا کہ یہ حدیث رسول ﷺ کی توہین ہوگی کہ حدیث کا علم بادشاہ کے محل میں چل کر جائے، فرمایا کہ جسے طلب ہے وہ یہاں آجایا کرے۔اس پر بادشاہ نے کہا کہ.....چلو علیحدہ پڑھا دیا کرو...... امام صاحب اس پر بھی نہ مانے کہ باقی طلباء کے ساتھ ہی شہزادے بھی پڑھیں گے۔بس پھر کیا تھا بعض درباری مولویوں نے جو پہلے ہی امام صاحب کی شہرت اور عزت سے حسد کرتے تھے، والی بخارا کو بھڑکایا اور امام صاحب کو بخارا سے جلا وطن کر دیا گیا۔

میں مسجد کو دیکھے چلے جا رہا تھا، اب محراب کے سامنے کھڑا تھا، امام صاحب کی زندگی کے لمحات میرے دماغ کی نگاہیں دیکھے چلی جارہی تھیں۔میں دیکھ رہا تھا کہ میرا امام یہاں سے نکل کھڑا ہوا اور پھر جب صحیح بخاری کو بھلا دیا گیا، حنفیت نے اپنا راج جمایا، تصوف یہاں آدھمکا، خواجہ بہاؤ الدین نقشبند کے سلسلہ نقشبندی کا یہاں چلن ہوا، پھر ان کی خانقاہ بنی اور دربار شرک وبدعت کا آستانہ بنا.....اس پر اللہ کے غضب کا کوڑا برسا اور اس نے برسنا ہی تھا کہ امام بخاری جیسے امام المحدثین کہ جنھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی حدیثوں کو اس قدر دور دراز علاقوں سے عرق ریزی سے اکٹھا کیا کہ وہ مصروف ترین امام چالیس سال تک

سالن کے ساتھ روٹی نہ کھا سکے۔ ان کی لکھی ہوئی کتاب ہدایت کی جب اس کی اپنی ہی قوم نے بے قدری شروع کردی، وہ اللہ کے فرامین کی بجائے ایک امتی کے اقوال کو دین بنا کر اور اس کی طرف منسوب ہوکر حنفی بن بیٹھے، روحانی تزکیے کے لیے نقشبندی بن بیٹھے، تب بخارا زیر وزبر ہوا، کبھی ترکمانوں کے ہاتھوں اور کبھی چنگیز کے ہاتھوں اور پھر تیمور کے ہاتھوں اور جب عیسائی مذہب کے حامل زاران روس بخارا پر حملہ آور ہوئے تو کیفیت تب بھی بقول مولانا ابوالکلام آزاد مصنف ''غبار خاطر'' یہ تھی کہ ادھر روسی فوجوں نے بخارا کا محاصرہ کر رکھا تھا اور ادھر امیر بخارا مدرسہ میر عرب کے طالب علموں، استادوں اور صوفیوں کو اکٹھا کر رہا تھا کہ وہ ختم خواجگان پڑھیں تا کہ روسیوں کو شکست ہو۔

مولانا لکھتے ہیں......اب لامحالہ ایک ایسا مقابلہ کہ جس میں ایک طرف ختم خواجگان ہو اور دوسری طرف توپ وتفنگ تو اس کا نتیجہ وہی نکلنا تھا جسے نکلنا چاہیے تھا......اور وہ نتیجہ پھر اس طرح نکلا کہ روسی قابض ہوگئے اور اہل بخارا تہ تیغ کر دیے گئے، مسجد کلاں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔اب بخارا مدصوں زاران روس کے صلیبی پنجوں میں پس کر ابتلا حتیٰ کہ کچھ تھوڑی سی داخلی خودمختاری دے کر زاران روس نے بخارا کی امارت ایک سابق حکمران خاندان کے حوالے کردی۔پھر اللہ نے مزید موقع دیا کہ ادھر جنگ عظیم اول میں روس تباہ حال ہوا اور ادھر امیر بخارا نے ۱۹۱۷ء کے اوائل میں بخارا کی مکمل آزادی کا اعلان کردیا......اب بجائے اس کے کہ امرائے بخارا داخلی خودمختاری سے فائدہ اٹھاتے یہاں لادینیت اور شرک کا استیصال کر کے کتاب وسنت کو رواج دیتے اور کامل آزادی ملنے پر کتاب وسنت کا قانون نافذ کرتے وہ اسی پرانی بے ڈھنگی چال اور ٹیڑھی ڈگر پر چلتے رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ روسی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھے لکھے طبقے نے جو کہ اصل اسلام قرآن وحدیث سے بے خبر تھا وہ حنفیت اور قبر پرستی کو ہی دین سمجھ کر اسلام سے انکار کی باتیں کرنے لگا، پھر اس طبقے نے ''جدید یہ یاش بخارا'' کے نام سے سیکولر پارٹی بنائی جو مذہب کا

مذاق اڑاتی تھی۔ امیر بخارا امیر عالم خان کی آنکھیں اس پر بھی نہ کھلیں کہ وہ سیکولرزم اور لادینیت کا مقابلہ اصل اسلام کے نفاذ سے کرتا حالانکہ اللہ نے اسے کامل آزادی کے ساڑھے تین سال دیے۔ بہر حال جب اس نے موقع ضائع کر دیا تو ان ملحدوں کو روسی کمیونسٹوں نے اپنے ساتھ ملایا اور ۲ ستمبر ۱۹۲۰ء کو بخارا ستر سال تک کے لیے کمیونزم کے پنجۂ استبداد میں چلا گیا۔

مسجد کلاں جو امام بخاری کے زمانے میں کچی ہوا کرتی تھی اور اب پختہ اینٹوں کی عظیم الشان شاہی مسجد ہے، روسیوں نے اسے شراب خانے میں بدل دیا۔ میں اس مسجد کے حجروں میں، اس کے ہال میں اور ہال کے ساتھ ملحق کئی ستونوں پر مبنی دوسرے بڑے ہال میں گھوم رہا تھا۔ یہ ساری مسجد ویران تھی، شراب کی بھٹیوں سے اٹی ہوئی تھی۔ اس سے بڑھ کر رب کے عذاب کا کوڑا اور کس طرح سے برسے گا کہ جہاں سے اللہ کے نبی ﷺ کی کتاب کو دیس نکالا دیا گیا وہاں شراب کی بھٹیاں بن گئیں۔ شراب پی کر روسی جانور یہاں کیا کرتے تھے اسے سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے، کمیونزم کا پرچار یہاں سے ہوتا تھا، سور مسجد میں کاٹے جاتے تھے۔

بہر حال ستر سال بعد اللہ نے ایک بار پھر اہل بخارا کو موقع دیا ہے، افغان جہاد کی ضرب سے امام بخاری کی مسجد کلاں پھر اپنے نمازیوں کے لیے کھل چکی ہے۔ اس کی مرمت جاری ہے۔ مگر کیا اب اس میں امام بخاری رحمہ اللہ کی کتاب کا درس دیا جائے گا یا کہ پھر اس پرانی ڈگر پر چلا جائے گا اور امام بخاری رحمہ اللہ کا بس نام ہی اس مسجد کے ساتھ لاحق رہ جائے گا؟ دائیں طرف عظیم مینار کلاں ہے جبکہ سامنے مدرسہ میر عرب ہے۔

مدرسہ میر عرب:

یہ مدرسہ آج سے ساڑھے چار سو سال قبل یمن کے ایک عربی شیخ عبداللہ نے بنوایا تھا چنانچہ انہی کے حوالے سے اسے مدرسہ میر عرب کہا جاتا ہے۔ یہ مدرسہ روسی کمیونسٹوں نے اپنی

نگرانی میں تقریباً تیس سال قبل ہی کھول دیا تھا، یہ مدرسہ کیا تھا، یہاں کمیونزم کی تعلیم دی جاتی تھی اور یہاں داڑھی منڈے ٹائی اور پتلون پہننے والے کمیونسٹ مولوی تیار کیے جاتے تھے ۔میں نے مدرسے میں دیکھا کہ طالب علموں اور اساتذہ کی تصویریں جگہ جگہ گروپوں کی شکل میں آویزاں تھیں ۔اور جب میں اس مدرسے کے ناظم سے ملا اور اس سے پوچھا کہ اب تو یہ مدرسہ کمیونسٹوں کے تسلط سے آزاد ہوگیا ہے تو اس وقت یہاں کا نصاب تعلیم کیا ہے ۔کیا اس نصاب میں امام بخاری رحمہ اللہ کی کتاب بھی موجود ہے؟ تو مجھے جواب نفی میں دیا گیا۔جبکہ اس وقت جو نصاب ہے اس کے بارے ناظم صاحب نے مجھے بتلایا تو وہ ہی حنفی مذہب پر مشتمل تھا۔

اس مدرسے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف والے کمرے میں کئی پختہ قبریں ہیں، میں اس کمرے میں داخل ہوا تو یہاں اس مدرسے کے بانی عبداللہ یمنی کی قبر تھی، امیر بخارا اور اس کے خاندان کی قبریں بھی تھیں اور یہ ساری پختہ تھیں جبکہ میر عرب اور امیر بخارا کی قبریں کافی بلند تھیں۔

یہ قبریں مسلمانوں کے عام قبرستان میں کیوں نہ بنائی گئیں؟ آخر مدرسے میں انھیں بنانے کا کیا مقصد تھا؟ قبروں کے یہ خصوصی اہتمام ہی تو شرک کا باعث بنتے ہیں اور پختہ قبر سے تو اللہ کے رسول ﷺ نے ویسے ہی منع کردیا ہے۔مسلم کی حدیث ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے پختہ قبر بنانے سے منع کیا ہے۔

مدرسے سے اب ہم باہر نکلے، بائیں جانب مینار کلاں اور اس کے ساتھ لائبریری دیکھتے ہوئے ہم محلے کی ایک پرانی مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے چلے گئے۔وہاں غسل کیا، وضو کیا اورظہر وعصر کی نمازیں اکٹھی کیں، آرام کیا اور پھر بخارا شہر گھومتے ہوئے مغرب کے وقت سٹیشن پر پہنچے۔ادھر سٹیشن پر وہی ڈاک والی گاڑی آچکی تھی، چنانچہ ہم گاڑی میں بیٹھ گئے، اپنے امام کا شہر ہم نے دیکھ لیا تھا۔وہ امام کہ جس کے نام سے اس شہر کا پوری دنیا میں نام

ہے، اس شہر کو بھی امام کے نام سے کہ یہ شہر ان کی پیدائش گاہ ہے اور ان کی لکھی ہوئی صحیح بخاری کہ جو قرآن کے بعد صحیح ترین حدیث کی کتاب ہے، اس پر فخر ہے۔مگر یہ محض فخر کی حد تک ہی ہے جبکہ عملی طور پر یہ لوگ عامل بالحدیث ہونے کے بجائے حنفی مذہب کے حامل ہیں اور پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ اب بخارا شہر میں یہودی بھی کافی تعداد میں ہیں۔بہر حال اب ہماری منزل ''سمرقند'' شہر تھا۔

سمرقند میں امام بخاری کی قبر پر:

رات بھر گاڑی چلتی رہی اور ۲۵ اگست کی صبح کو پانچ بجے ہم سمرقند میں تھے، سٹیشن پر ٹیکسی والے کو کہا کہ ہمیں امام بخاری کی قبر پر جانا ہے۔وہ کہنے لگا خواجہ اسماعیل؟ ہم نے کہا ہاں خواجہ اسماعیل۔یہاں سمر قند میں لوگ امام بخاری کو خواجہ اسماعیل کہتے ہیں حتیٰ کہ ''خرتنگ'' وہ بستی جہاں امام صاحب کی قبر ہے، اس بستی کو بھی خواجہ اسماعیل ہی کہا جاتا ہے۔ بہر حال یہاں ۲۵ کلومیٹر دور تقریباً پونے گھنٹے بعد ہم بستی خواجہ اسماعیل میں تھے۔اب ہم اس بستی کے قریب ایک وسیع وعریض پر فضا مقام پر تھے۔یہیں امام بخاری کی قبر ہے، جب ہم مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوئے تو یہاں موجود لوگوں نے ہمیں دیکھتے ہی آگے بڑھ کر بڑے تپاک سے مصافحے اور معانقے کیے۔میرے ہم سفر ترجمان ساتھی فتح اللہ نے میرا تعارف کروایا تو یہ لوگ اور بھی خوش ہوئے۔اب ہمارا رخ امام بخاری کی قبر کی طرف تھا۔ چلتے ہوئے دائیں جانب مسجد تھی جبکہ سامنے امام بخاری کی قبر تھی، جب قبر پر پہنچے تو امام صاحب کے لیے بے ساختہ دونوں ہاتھ رب کے حضور اٹھ گئے۔

امام بخاری رحمہ اللہ اور نواز شریف:

یہاں کے نائب امام نے قبر سے ملحق کمرا دکھلایا، اس نے مسجد کی دیوار کے ساتھ قبر کے پہلو میں ایک حجرے کی طرف اشارہ کیا اور بتلایا کہ یہاں لوگ عبادت کرتے ہیں، چلے

کشیاں کرتے ہیں۔ میں خاموشی کے ساتھ سب کچھ دیکھتا رہا اور سنتا رہا۔ اب ہم کھلے صحن میں آ گئے تھے، یہاں ایک بڑے چوکور پلنگ پر گدے اور تکیے سجا دیے گئے تھے، ہمیں یہاں بٹھا دیا گیا تھا۔ اب گفتگو شروع ہوگئی، میں نے کہا ہمارے وزیر اعظم نواز شریف صاحب بھی پچھلے دنوں یہاں آئے تھے اور انھوں نے امام صاحب کے مزار کے لیے چالیس ہزار ڈالر کا اعلان کیا تھا تو کیا تعمیراتی کام شروع ہو چکا ہے؟ نائب امام نے کہا ہاں کام شروع کر دیا گیا ہے...... میں نے کہا لاہور سے ہمارا ایک ماہنامہ ''مجلة الدعوة'' نکلتا ہے، ہم نے جب وہاں نواز شریف کا یہ بیان اخبار میں پڑھا تو اس پر اداریہ لکھا اور نواز شریف سے کہا کہ...... کاش! آپ امام بخاری کے مزار پر جانے سے قبل بخاری پڑھ لیتے؟ میرے اس جملے پر امام صاحب سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگے اور پھر بولے آپ کا اس سے کیا مطلب ہے؟ میں سمجھا نہیں۔ میں نے کہا آپ نے بخاری پڑھی ہے؟ فرمانے لگے پڑھی تو نہیں۔ میں نے کہا تو پھر سنیے! امام بخاری اپنی صحیح میں ایک حدیث لائے ہیں:

''مومنوں کی ماں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے حبشہ میں عیسائیوں کا گرجا دیکھا جس میں تصاویر بھی آویزاں تھیں تو اس کا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان میں جب کوئی نیک آدمی مر جاتا تو یہ لوگ اس کی قبر کے پاس عبادت گاہ تعمیر کر دیتے اور پھر اس (عبادت گاہ) میں اس شخص کی تصویر لٹکا دیتے اور! یہ لوگ اللہ کے ہاں بدترین مخلوق ہیں۔''

میں نے کہا یہ حدیث امام بخاری لائے ہیں، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ امام صاحب تو قبروں پر عبادت گاہوں اور چلہ کشیوں کے لیے حجروں کے صریحاً مخالف ہیں۔ پکی قبر سے بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما رکھا ہے...... تو اگر نواز شریف بخاری شریف پڑھتا تو بھلا کیا ہزاروں ڈالر کا اعلان کر کے جاتا کہ جس اعلان کے امام بخاری صریحاً مخالف ہیں اور اگر آپ بخاری شریف پر عمل کرتے تو کبھی ایسا نہ کرتے۔ امام صاحب نے میری اس گفتگو پر

کہا کہ جناب پہلے تو امام صاحب کی قبر کچی ہی ہوا کرتی تھی، یہ پختہ تو بعد میں بنی ہے، باقی جو آپ فرماتے ہیں سچ تو یہی ہے اور اب میں اس کا کیا جواب دے سکتا ہوں؟

امیر تیمور کے مقبرے پر:

امیر تیمور جو کہ چنگیز خان کی نسل سے تھا، وہ اسلام قبول کرنے والے قبیلے ''برلاس'' سے تعلق رکھتا تھا، ۱۳۳۵ء کو سمرقند کے مضافات میں واقع ''کوش'' شہر میں پیدا ہوا، بعد میں تیمور نے اس کا نام ''سبز'' رکھا، سمرقند کو پایہ تخت بنایا، فتوحات میں وہ چنگیز سے بھی بازی لے گیا، دہلی کو اس نے تاراج کیا، افغانستان اس کے زیرنگیں تھا، سارا وسط ایشیا روس، ایران، ترکی، عراق اور شام وغیرہ کو اس نے تلوار کے زور پر زیر کیا۔

آٹھویں صدی ہجری کا یہ وہی دور ہے کہ جس میں صوفیت اور مزار پرستی مسلمانوں میں جڑ پکڑ رہی تھی، یہ تاتاری بھی اسی دور میں مسلمان ہوئے، تلوار کے تو وہ دھنی تھے ہی اب انھوں نے اسلام قبول کیا تو اسلام انھیں تصوف ومزارات والا ملا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ امور جہانبانی میں تیموری بادشاہوں نے تورہ چنگیزی سے راہ نمائی لی اور اپنے اصول وضع کیے وگرنہ اگر تیمور جیسے بادشاہ کو جو کہ ایک چوتھائی دنیا کا فاتح تھا، صحیح اور اصل اسلام مل جاتا تو اس جہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ مگر افسوس کہ صوفیت کے اس دور میں تیمور نے بھی اپنا پیر پکڑا اور اسی سے راہ نمائی لیتا تھا، فتوحات میں اس نے اتنی قتل وغارت کی کہ تاریخ میں یہ اس کے نام پر ایک سیاہ داغ ہے۔ مگر اس کے باوجود امیر تیمور اپنی خودنوشت سوانح میں لکھتا ہے کہ میں نے جو بھی فتوحات کیں شریعت محمدی ﷺ کے لیے کیں، ظلم مٹانے اور انصاف کے قیام کے لیے کیں۔ اپنے وقت کا یہ انتہائی باجبروت بادشاہ جو کہ اپنے آپ کو بادشاہ کی بجائے امیر کہلواتا تھا، اتفاق سے اس کا نام بھی تیمور تھا جس کے معنی لوہے کے ہیں، وہ واقعی اسم بامسمی تھا۔ میں اس کے مقبرے پر ہی کھڑا تھا، اس کے اندر داخل ہوا، گنبد کے نیچے یہاں کوئی دس بارہ قبریں تھیں، بڑی قبر امیر کے پیر کی تھی، اس سے نیچے چھوٹی قبر امیر تیمور کی

تھی، اس کے دو بیٹوں اور الغ بیگ کی قبریں بھی یہیں ہیں۔الغ بیگ بادشاہ تو تھا مگر اسے زیادہ دلچسپی سائنس کے شعبہ فلکیات سے تھی اور اس مقصد کے لیے اس نے رصدگاہ بھی بنائی تھی۔وہ اتنا بڑا سائنسدان تھا کہ اس نے ٹیلی سکوپ کی ایجاد سے چار صدیاں قبل اپنے دور میں جو فلکیاتی جدول بنائی سائنس اس پر اب تک کوئی اضافہ نہیں کرسکی۔

امیر تیمور کے مقبرے پر (علی ہجویری کا) دربار یاد آگیا:

جب ہم یہ مقبرہ دیکھ چکے تو محافظ نے بتلایا کہ اصل مقبرہ تو نیچے ہے۔چنانچہ ہم یہاں سے نکل کر ایک دوسرے کمرے میں داخل ہوکر سیڑھیوں کے ذریعے نیچے چلے گئے تو پتا چلا کہ یہ ہیں اصل قبریں جبکہ ان کی سیدھ میں اسی گنبد میں ان اصلی قبروں کے اوپر قبریں بناوی گئی ہیں جو کہ جعلی ہیں۔ایسا کرنے میں کیا حکمت کارفرما تھی یہ تو اللہ ہی بہتر جانتے ہیں البتہ مجھے لاہور میں جناب علی ہجویری صاحب کا دربار یاد آگیا کہ جسے لوگ داتا دربار کہتے ہیں، اس بھاٹی گیٹ والے دربار میں بھی واقع قبر کہ جسے لوگ داتا کی قبر سمجھ کر اس سے لپٹتے اور سجدہ ریز ہوتے ہیں، یہ بھی جعلی ہے جبکہ اصل قبر اس کے نیچے ہے جہاں بہت کم اور خاص لوگوں کی رسائی ہوتی ہے اور یہ جو نیچے اصلی قبر ہے تو درحقیقت اصلی یہ بھی نہیں ہے بلکہ اصلی قبر تو لاہور کے شاہی قلعے میں شیش محل کے پہلو میں زمین کے نیچے واقع ایک گنبد میں ہے......میں داتا صاحب کی اصلی قبر دیکھ چکا ہوں اور ''داتا دربار کی تلاش میں'' کے نام سے اس پر مضمون بھی لکھ چکا ہوں جو مجلۃ الدعوۃ میں چھپنے کے بعد اب میری کتاب ''شاہراہ بہشت'' کی زینت بنا ہے۔

لوگوں کی عقیدت کا بھی عجیب حال ہے، جب وہ اندھی عقیدت کی رو میں بہ نکلتے ہیں تو وہاں عقل کی دخل اندازی ممنوع قرار پاتی ہے......نہیں تو بھلا......کیا داتا کی بھی قبر ہوتی ہے؟ داتا کی بات چلی ہے تو عرض کرتا جاؤں کہ داتا کا معنی ہے دینے والا اور لوگ دیگیں پکا کر اور اپنے گھر سے دودھ کے مٹکے بھر کر وہاں لے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ داتا دیتا ہے، داتا تو تب کہیں کہ جب مزار سے مختلف چشمے جاری ہوں، یہ دودھ کا ہے، یہ بیٹوں کا ہے کہ وہاں

سے بچے نکل رہے ہیں، یہ روپوں کا سوراخ ہے کہ وہاں سے ہزار کے نوٹ برآمد ہو رہے ہیں.....تو یہ کیا ہوا کہ ہر وہ چیز جسے اللہ پیدا کرتا ہے اسے ایک شخص کے نام منسوب کر کے اور اپنی طرف سے داتا کا لقب دے کر کہنا شروع کر دیا کہ یہ داتا دیتا ہے۔سوچنے اور عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے کہ بھلا کہیں داتا کی بھی قبر ہوتی ہے؟

میرے پیارے قارئین کرام! یہ کیا ہوا کہ سمرقند سے خیالات کی دنیا میں لاہور پہنچ گیا حالانکہ میں ابھی سمرقند میں ہوں،تیمور کے مقبرے پر ہوں، خیال کی دنیا مجھے لاہور میں اس لیے لے آئی کہ مزار تیمور اور مزار علی ہجویری میں ایک مماثلت تھی.....بہر حال تیمور کے مقبرے سے نکلا اور ایک اور مزار کے قریب سے گزرا جس کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ یہ مزار حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں،ان کے بیٹے حضرت قثم کا ہے، یہاں سے چلے تو تیمور کی بنائی ہوئی ایک بہت بڑی تاریخی مسجد بھی دیکھی، اس مسجد کو امیر تیمور نے اپنی بیگم کے نام پر بنایا تھا، اس لیے اس کا نام ''مسجد بی بی خانم'' ہے۔ یہ مسجد اور اس سے ملحق دوسری اہم عمارتیں جن کا رقبہ کئی ایکڑ زمین پر مشتمل ہے،کمیونسٹ دور میں یہ کارخانے اور شراب خانوں میں بدل دی گئی تھیں۔اب جب میں وہاں پہنچا تو ان کے دروازے کھل چکے تھے،کاریگر کام کر رہے تھے، ستر سال تک شراب و کباب کی آلودگیوں کے بعد اب یہ مسجد پھر سے آباد ہونے کو ہے، افغان جہاد کی برکت سے یہاں جبینیں پھر سے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہونے والی ہیں۔

یہاں سے نکلے،سمرقند کی مارکیٹ میں پہنچے،سمرقندی روٹی خریدی، بس میں بیٹھے اور تاشقند کی طرف عازم سفر ہوئے۔

تاشقند میں:

آج ۲۵ اگست کو روس کے طویل دورے کے بعد دوبارہ تاشقند میں پہنچا ہوں جبکہ ۱۳ اگست کو اپنے ساتھی حافظ عبدالعزیز کے ہمراہ میں اسلام آباد سے تاشقند ایئرپورٹ پر

اترا تو ایئرپورٹ سے باہر نکلتے ہی ایک ٹیکسی ڈرائیور کو روسی زبان میں ایک پتا دکھایا اور ۷۰ روبل طے کر کے چل دیے۔ یہ پتا شیخ تاجی بائی کا تھا۔ پروفیسر حافظ محمد سعید کے چھوٹے بھائی حافظ حامد صاحب دو عرب ساتھیوں کے ساتھ چند دن قبل یہاں سے ہو کر گئے تھے اور یہ پتا ہم نے انھیں سے لیا تھا۔ انھوں نے بتلایا تھا کہ یہ بزرگ کتاب وسنت کے عالم اور توحید کے داعی ہیں، چنانچہ ہم ڈھونڈتے ڈھونڈتے آخر کار ان کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ ان کے دو شاگرد ہمیں ایک مسجد میں لے گئے، ہم وہاں پہنچے تو نماز مغرب کا وقت ہو چکا تھا، ۳۵، ۴۰ نوجوان مسجد میں جمع ہو گئے، معانقے اور مصافحے شروع ہو گئے، محبت کا ایک سماں تھا اور یہ سماں اسلام کی برکت سے تھا، ہمیں یوں لگ رہا تھا جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے سے شناسا ہیں۔ اذان کے بعد اب تکبیر ہوئی اور مجھے آگے کر دیا گیا، صف بندی شروع ہوگئی، کندھے کے ساتھ کندھا اور پاؤں کے ساتھ پاؤں ملنا شروع ہوگیا اور پھر "ولا الضالین" کے بعد مسجد آمین کی آواز سے گونج اٹھی۔ نماز سے فارغ ہوئے تو نوجوان ہمارے گرد اکٹھے ہو گئے، سنت اللہ نے کہا شیخ تاجی کچھ دیر بعد آجائیں گے، آپ کا کھانا ہمارے گھر ہے، لہٰذا آئیں اور چلیں۔ اب چار پانچ نوجوان اور ہم بھائی سنت اللہ کے گھر چل دیے، پھل اور میوہ جات کے بعد کھانا دستر خوان کی زینت بنا دیا گیا۔ ادھر شیخ گھر میں آئے تو انھیں پاکستانی مہمانوں کے آنے کی اطلاع ہوگئی، شیخ بڑی اچھی عربی بولتے تھے لہٰذا یہی زبان ہمارے درمیان اظہار بیان کا ذریعہ تھی۔ شیخ سے ان کی دعوتی سرگرمیوں کی تفصیل سنی اور مرکز الدعوۃ کی دعوتی سرگرمیوں سے آگاہ کیا۔ اب عشاء کا وقت ہو چکا تھا، شیخ نے اب پھر مجھے مصلے پر کھڑا کر دیا، نماز کے بعد دعوت خطاب دی، میں نے عربی میں دس پندرہ منٹ تقریر کی، شیخ نے ترجمہ کیا اور پھر یہاں سے فارغ ہو کر مسجد کے قریب شیخ ہمیں اپنے بیٹے کے گھر لے گئے، وہاں دوبارہ کھانا تیار تھا، خیر چند لقمے لیے اور پھر شیخ نے کہا تاشقند شہر سے چند کلومیٹر دور ہمارا گاؤں ہے میں تو رات وہاں رہتا ہوں، باقی آپ کی مرضی رات یہاں ٹھہریں یا میرے پاس

گاؤں میں چلیں۔ ہم نے کہا کہ شیخ صاحب ہم تو گاؤں چلیں گے۔ شیخ نے جیپ نکالی اور ہم گاؤں کی طرف روانہ ہوگئے۔ ۱۵، ۲۰ منٹ کے بعد شیخ کا گاؤں آ گیا اور پھر رات شیخ کے گھر گزاری، صبح ہوگئی تو شیخ کی جیپ پر تاشقند شہر دیکھنے کو نکلے۔

تاشقند کا مدرسہ قوقلداش:

روس کا سب سے بڑا شہر اس کا دارالحکومت ''ماسکو'' ہے، دوسرا بڑا شہر ''لینن گراڈ'' تیسرا یوکرائین کا ''کیف'' اور چوتھا بڑا شہر تاشقند ہے۔ آزادی کے بعد اب یہ ترکستان یعنی پانچ مسلم ریاستوں میں سب سے بڑا شہر ہے۔ ''میٹرو'' یعنی زیر زمین ریل بھی انہی چار شہروں میں چلتی ہے۔ تاشقند کا پرانا اور تاریخی نام ''شاش'' ہے، یہ صاف ستھرا، کھلا، شاداب اور ازبکستان کا دارالحکومت ہے۔ ہم اس شہر کے سب سے بڑے مدرسے ''قوقلداش'' میں گئے، اس مدرسے کو ۱۶ ویں صدی عیسوی میں خواجہ احرار نے بنوایا تھا، اس مدرسے کے مدیر حاجی محمد قاسم ہیں۔ شیخ نے ان سے ہمارا تعارف کروایا تو بڑے خوش ہوئے۔ مدیر مدرسہ انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ اچانک تعلیم کو چھوڑا اور خفیہ طور پر دینی تعلیم کے حصول میں لگ گئے اور پھر بچوں کو چھپ کر دینی تعلیم دینے لگے، روسیوں کو پتا چلا تو انھیں اس جرم کی سزا میں جیل بھیج دیا، دو سال جیل میں رہے، یہ شیخ کے شاگرد بھی ہیں۔ اب افغانستان میں روس کی شکست کے بعد دو سال قبل یہ مدرسہ آزاد ہوا، افغان جہاد کی ضرب نے اس کا تالا توڑا تو حاجی صاحب اس مدرسے کے مدیر ٹھہرے، اب وہ ہماری ضیافت کرنے کے بعد ہمیں مدرسہ دکھلا رہے تھے، مدرسے کو کارخانے میں بدل دیا گیا تھا، ستر سال تک اس میں تخریب کاری ہوتی رہی، اب اس کی تعمیر جاری تھی اور تعلیم بھی۔ بچیوں سے لے کر نوجوان لڑکیوں تک یہاں تعلیم حاصل کر رہی تھیں، تاشقند کے عریاں معاشرے میں ان لڑکیوں کے سروں پر سفید رومال دیکھ کر دل بڑا خوش ہوا کہ دین کی طرف اور پردے کے اسلامی تصور کی طرف سفر بہر حال شروع ہو چکا ہے۔

مصحف عثمان رضی اللہ عنہ کی زیارت اور علم کے موتیوں کا گھر:

شیخ اب ہمیں پرانے شہر کی سیر کروا رہے تھے، یہ پرانا شہر بھی ہمارے پرانے لاہور کی طرح تنگ نہ تھا بلکہ کھلا تھا، جیپ پر ہم اس شہر میں گھوم رہے تھے، گھومتے ہوئے ایک مسجد کے سامنے آ کر رک گئے، اس مسجد کا نام "طلاشیخ" ہے یعنی سونے کا شیخ۔ ممکن ہے یہ شیخ سونے کا کاروبار کرتے ہوں، بہر حال یہ مسجد جو چارسو سال پرانی ہے، انھوں نے ہی بنوائی ہے، یہ بڑی خوبصورت اور وسیع مسجد ہے، مسجد کو دیکھنے کے بعد ہم کتب خانے کی طرف گئے جو اسی مسجد کے صحن میں ہے۔ ہم دروازے پر پہنچے تو دن کا پچھلا پہر تھا، ایک نوجوان دروازے کو تالا لگا رہا تھا، ہم نے السلام علیکم کہا، تعارف کروایا اور پھر اس نوجوان نے ہمارے لیے دروازہ کھول دیا، اب ہم علم کے موتیوں کے گھر میں تھے۔

یہ نوجوان لڑکا جس کا نام نور محمد ہے، اس مکتب کا نائب مدیر ہے، عربی زبان جانتا ہے، اس نے ایک بڑے کمرے کا دروازہ کھولا اور بتلایا کہ اس کتب خانے کا نام "کتب خانہ مسلمانان ماوراء النہر" ہے۔ ہم نے اس ہال میں قرآن وحدیث اور دیگر کتب کے قیمتی اور تاریخی قلمی نسخے دیکھے اور جب اتفاق سے میری نظر چھت پر پڑی تو معلوم ہوا جیسے چھت بھی کتابوں کی ڈالی گئی ہے جبکہ یہ چھت کتابوں کی تو نہیں تھی بلکہ لکڑی کو رنگ ہی اس انداز سے کیا گیا تھا کہ وہ لائینوں میں لگی ہوئی کتابیں معلوم ہوتی تھیں۔

اب ایک دوسرے ہال کمرے کا دروازہ کھولا گیا، اس میں ہر موضوع پر بے شمار کتابیں تھیں، الماریوں کی الماریاں بھری ہوئی تھیں۔ میں نے نور محمد سے پوچھا کہ یہ کتابیں کمیونسٹوں کے دور میں کیسے باقی رہ گئیں؟ تو اس نے کہا کہ جب انقلاب آیا تو لوگوں نے یہ کتابیں گھروں میں چھپالیں اور نہ جانے کس کس کے پاس کہاں کہاں کتاب چھپی رہی، اب دوسال قبل جب ہمیں آزادی ملی ہے تو لوگوں نے وہ کتابیں یہاں جمع کرانا شروع کر دیں اور یوں دوبارہ ایک عظیم لائبریری بن گئی ہے۔ جبکہ ابھی توقع ہے کہ یہ مزید بڑی ہوگی۔

(ان شاء اللہ) اور دفینے برآمد ہوں گے، آباء نے علم کے جو موتی جمع کیے تھے وہ بکھرنے کے بعد پھر یہاں اکٹھا ہوں گے۔

اس ہال سے نکلنے کے بعد دوبارہ پہلے ہال میں آئے تو درمیان میں چبوترے پر ایک بڑی کتاب دکھائی دی، نور محمد نے کہا یہ مصحف عثمان رضی اللہ عنہ ہے۔ہم آگے بڑھے مگر یہ تو فوٹو کاپی تھی، میں نے جھٹ کہا بھائی نور محمد یہ تو فوٹو کاپی دکھلا رہے ہو، اصل کہاں ہے؟ اب اس نے ایک دروازہ کھولا، ہم اس میں داخل ہوئے تو پھر ایک اور دروازہ تھا، اسے کھولا، اب ہم ایک کمرے میں شیشے کی الماری کے سامنے کھڑے تھے، مصحف عثمان رضی اللہ عنہ اب میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ہرن کی کھال پر یہ لکھا گیا ہے، اللہ کے رسول ﷺ کے محبوب صحابی اور دوہرے داماد اور خلیفہ ثالث عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو جب مظلومیت کی حالت میں شہید کیا گیا تو وہ یہی قرآن تلاوت فرما رہے تھے ان کے خون کے چھینٹے جس جگہ پڑے وہ یہ آیت تھی:

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣٧﴾ (البقرۃ:۱۳۷)

''اور ان کے مقابلے میں تمھیں اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔''

اس جگہ نشانی رکھی ہوئی تھی جبکہ ہمارے سامنے کا جو مقام کھلا تھا وہ سورۂ زمر تھی۔ اس الماری کے اوپر سورۃ الحجر کی یہ آیت لکھی ہوئی تھی:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿٩﴾ (الحجر:۹)

''بے شک ہم اس قرآن کو اتارنے والے ہیں اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

اللہ کے رسول ﷺ پر ۲۳ سالوں میں قرآن نازل ہوکر مکمل ہوا، یہ قرآن صحابہ رضی اللہ عنہم کے سینوں میں محفوظ تھا اور لکھا ہوا بھی تھا، اس لیے کہ اللہ کے رسول ﷺ صحابہ سے لکھوا لیا کرتے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قرآن کا ایک نسخہ تیار کروایا، ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو یہ نسخہ ان کی وساطت سے ام المومنین حضرت

حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں اسی مصحف سے چھ مصحف تیار کروائے اور وہ ملک کے مختلف علاقوں میں بھیجے تاکہ ان کے مطابق نقلیں تیار ہو کر مسلمانوں میں پھیلیں۔ چنانچہ ان چھ میں سے وہ قرآن جو کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زیر تلاوت تھا وہ اب تاشقند میں محفوظ ہے اور دنیا بھر میں چودہ سو سال سے اللہ کی اس کتاب میں زیر و زبر کی تبدیلی بھی واقع نہیں ہوئی اور ہوتی کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔

شیخ تاجی اور ان کی تفسیر:

شیخ کے گھر میں ایک روز صبح ناشتے پر اکٹھے ہوئے تو میں نے شیخ تاجی سے پوچھا کہ آپ نے تعلیم کیسے اور کس سے حاصل کی؟ یہاں تو نہ ایسی تعلیم کی اجازت تھی نہ کوئی اتنا بڑا عالم دین باقی رہ گیا تھا اور نہ ہی کتابوں کا وجود تھا۔ تو انھوں نے کہا ۵۰ سال قبل جبکہ جبر و تشدد کا کمیونسٹ دور اپنے عروج پر تھا تو ایک شامی عالم دین یہاں آئے، ان کے اصل نام سے تو کوئی واقف نہ تھا البتہ داملہ شامی (مولانا شامی) کے نام سے وہ معروف تھے، صابر داملہ نے ان سے چھپ چھپا کر تعلیم حاصل کی اور یہ صابر داملہ میرے استاد ہیں، ان سے میں نے تعلیم حاصل کی۔ جبکہ کتابیں نایاب تھیں تو شیخ کہنے لگے ہمیں جس کے بارے میں معلوم ہوتا کہ اس کے پاس فلاں کتاب ہے تو وہ کتاب ادھار لے کر اسے ہاتھ سے لکھتے اور علم حاصل کرتے پھر یہ علم بھی بند اور خفیہ کمروں میں حاصل کرتے تاکہ کسی کو پتا نہ چل سکے، اب اللہ کا شکر ہے کہ محنت و مشقت اور خوف کی وہ حالت جاتی رہی۔ اس پر میں نے کہا کہ شیخ صاحب اس خوف کو ختم کیا ہے تو افغانستان کے جہاد نے کیا ہے۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ شیخ صاحب قرآن کا ترجمہ اور تفسیر اٹھا لائے جو کہ ازبکی زبان میں چھ جلدوں میں ہے اور اسے پچھلے تیرہ سالوں میں شیخ نے مکمل کیا ہے۔

قارئین کرام! ذرا غور کیجیے! روس میں اسلام کس قدر سخت جان ثابت ہوا کہ اس کے ایک نام لیوا نے علم حاصل کیا، پھر تیرہ سال کے عرصہ میں تفسیر لکھی، پھر اپنے ساتھیوں سے

چندہ اکٹھا کر کے خفیہ طور پر دو سو کی تعداد میں اس تفسیر کو چھپوا بھی ڈالا پھر اس نور کو آگے پھیلا دیا۔ آج اس شیخ کے کئی شاگرد ہیں، اس کا گھر مقامی بچوں کو قرآن کی تعلیم دینے کا آج بھی سرچشمہ ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شیخ نے کس قدر دلیری اور جرأت کا مظاہرہ کیا وگرنہ اگر کمیونسٹ باخبر ہوجاتے تو شیخ کی سزا گولی اور پھانسی سے کم نہ ہوتی۔

قازقستان میں دعوتی سرگرمیاں:

قازقستان جوکہ تاشقند کے قریب ہی ہے وہاں دعوت اور سیر وسیاحت کا پروگرام بنایا گیا، رات شیخ کے گاؤں میں ہی بسر ہوئی تو شیخ کے تین چار پرانے شاگرد بھی آگئے، وہ بھی ہمراہ ہولیے اور ہم عازم قازقستان ہوئے۔ آدھ گھنٹہ بعد ہم قازقستان میں تھے اور پھر ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم ایک شہر ''لیلیس'' میں پہنچے، یہاں تھوڑی دیر رکنے کے بعد ہم ایک قصبے ''تربت'' میں جا پہنچے۔ ہم اس قصبے کے قبرستان میں گئے، دیکھا بڑا پختہ قبرستان تھا اور بعض قبروں پر اہل قبور کی تصاویر بنائی گئیں تھیں۔ اسی طرح یہاں دو تین مزار بھی تھے جو مختلف ولیوں کے تھے۔ ایک مزار میں گھپ اندھیرا تھا، اس میں اس شخص کو داخل کرتے ہیں جسے جنات لاحق ہوگئے ہوں۔ غرض یہ سب دیکھنے کے بعد ہم قریب ہی ایک مسجد میں چلے گئے، یہ مسجد کافی بڑی اور پرانی تھی، مسجد میں قالین بچھے ہوئے تھے اور ایک جگہ لمبی لائن میں تیار کی ہوئی پگڑیاں پڑی تھیں۔ اب ظہر کا وقت ہوچکا تھا، امام صاحب آگے بڑھے اور ہم نے نماز ظہر ادا کی۔ نماز کے بعد امام صاحب کو معلوم ہوا تو انھوں نے سب نمازیوں کو ہمارے بارے میں بتلایا اور پھر مجھے دعوت سخن دی۔ تب میں نے اس قصبے کے نمازیوں سے جوکہ ۳۵، ۴۰ کے قریب تھے، گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو یہ آزادی اللہ تعالیٰ نے افغان جہاد کی برکت سے دی ہے اور یہ آزادی آپ سے اس وقت چھینی گئی تھی جب آپ سے دین چھوٹ گیا تھا، لہٰذا اب آپ آزادی کی نعمت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دین کی طرف لوٹیں، قرآن کا ترجمے سے مطالعہ کریں اور احادیث کا مطالعہ کریں، امام بخاری، امام ترمذی اور امام

نسائی آپ کے علاقے ترکستان میں حدیث کا علم پھیلاتے رہے اور یہی علم اصل دین ہے جو کہ اللہ کے رسول ﷺ کی زبان سے نکلا ہے اور پھر آخر پر انھیں آگاہ کیا کہ کس طرح امام بخاری اور دیگر محدثین نے اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث کو بیان کیا ہے کہ جن میں آپ ﷺ نے پختہ قبریں بنانے اور ان پر عمارتیں بنانے سے منع کیا ہے۔ میری تقریر کا ترجمہ شیخ صاحب کر رہے تھے۔

دعوت کے اس پروگرام کے بعد ایک ہوٹل میں کھانا کھایا اور گھوڑی کا دودھ پیا، یہ بہت کھٹا تھا، میں نے تو دو تین گھونٹ ہی لیے جبکہ میرے ساتھیوں نے خوب پیا۔ قازقستان میں گھوڑے بہت ہوتے ہیں حتیٰ کہ لوگ بھیڑیں بھی گھوڑوں پر بیٹھ کر چراتے ہیں، گھوڑوں کا گوشت کھاتے ہیں اور دودھ پیتے ہیں اور یہ دودھ گائے کے دودھ سے مہنگا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ قازقستان میں پٹرول سات روبل کا لیٹر ہے جبکہ ازبکستان میں ۱۰ روبل کا لیٹر ہے۔ اسی طرح بھیڑ کا گوشت بھی قازقستان میں ۵۵ روبل فی کلو جبکہ ازبکستان میں ۱۴۰ روبل فی کلو ہے۔ جبکہ روبل کا حال اب یہ ہے کہ وہ ایک ڈالر کا پانچ صد مل جاتا ہے۔

شادی اور تبلیغ:

میرے ہم سفر ساتھی بھائی فتح اللہ کے سسرال بھی قازقستان میں ہیں، ان کی دعوت پر ان کے سسرال بھی جانا ہوا اور پھر ان کے عزیزوں کے گاؤں میں بھی۔ وہاں ہم نے گھروں میں جا کر انفرادی دعوت دی، لوگ ظہر کے وقت مسجد میں اکٹھے ہو گئے، نماز پڑھانے کے بعد میں نے تقریر شروع کر دی۔ امام بخاری کے حوالے سے مسجد میں گفتگو کی تو تقریر کے بعد ایک بوڑھا قازقستانی اٹھا اور کہنے لگا ہمیں بخاری لا کر دو ہم اسے پڑھیں، امام بخاری ہمارے علاقے کا عالم ہے مگر کسی نے ہمیں بتلایا ہی نہیں کہ وہ تو اتنا بڑا عالم تھا۔ اسی طرح ایک چالیس سالہ نوجوان جو کہ تقریر سنتا رہا مگر اس نے نماز نہیں پڑھی، جب میں نے اس سے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگا ابھی میری عمر کم ہے۔ تب میں نے اسے سمجھایا کہ موت کا کیا پتا کب

آ جائے اور یہ کہ چالیس سال عمر کوئی تھوڑی عمر نہیں ہے۔

مسجد کے قریب ہی شادی تھی، لہٰذا ہمیں دعوت ولیمہ دی گئی، ہم جب اس دعوت میں پہنچے تو لوگ ایک پاکستانی مسلمان کو اپنے درمیان پا کر بڑے خوش تھے۔ اب میں نے تقریر شروع کر دی، تقریر کے بعد کھانا کھایا، کھانے کے بعد دولہا کے والد نے سب شرکاء کو پانچ پانچ روبل دیے، جب مجھے دینے لگے تو میں نے سو (۱۰۰) روبل کا نوٹ جیب سے نکالا اور انہیں دینے لگا اور کہا کہ ہمارے ہاں تو شرکائے دعوت پیسے دیتے ہیں۔ اس پر وہ کہنے لگے ہمارے ہاں شرکائے دعوت کو کھانا کھلایا جاتا ہے اور پیسے بھی دیے جاتے ہیں تو آپ چونکہ قازقستان میں ہیں اس لیے یہاں تو قازقستانی رواج ہی چلے گا اور پھر پانچ روبل میری جیب میں ڈال دیے گئے۔

جب کھانے سے فارغ ہوکر باہر نکلے تو نوجوانوں نے ہمیں گھیر لیا، وہ اصرار کرنے لگے کہ آپ رات یہیں گزاریں اور رات کو ہمیں دعوت دیں۔ میں ہاں کرنے ہی والا تھا کہ بھائی فتح اللہ نے مجھے بتلایا آپ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ ریکارڈنگ کے ڈیک سیٹ کر رہے ہیں، اسٹیج بن رہا ہے تو رات کو سب لڑکے اور لڑکیاں شراب کی محفل سجائیں گے۔ ڈانس کریں گے تو یہاں ہماری دعوت کون سنے گا؟ انھوں نے کہا یہاں ہر شادی میں ایسا ہوتا ہے چنانچہ میں نے شرکت سے معذرت کر لی۔

اسی روز ہم واپس تاشقند آ گئے، میں نے فتح اللہ سے پوچھا کہ آپ کے ہاں جہیز کی رسم بھی ہے؟ تو اس نے بتلایا ہاں موجود ہے مگر اس طرح کہ قازق لوگوں میں لڑکے والے لڑکی کے گھر پیسے بھیجتے ہیں، انہی پیسوں سے دلہن کا جہیز تیار ہوتا ہے، جبکہ ازبک لوگوں میں آدھا خرچہ لڑکے والے کا اور آدھا خرچہ لڑکی والوں کا ہوتا ہے اور اسے ملا کر دولہا دلہن کے لیے ضروریات زندگی کا سامان تیار کیا جاتا ہے۔

شادی پر جلسہ:

ہمارے دیہات میں دیندار لوگوں کی شادیاں ہوتی تھیں تو وہ اس موقع پر مسجد میں جلسے کا انعقاد کر دیتے جبکہ بے دین لوگ مجرے کا اہتمام کرتے۔ کچھ ایسی ہی صورتحال آج کل ازبکستان میں ہے یہاں دو تین شادیوں میں شامل ہونے کا موقع ملا، دعوت طعام کے ساتھ دعوت خطاب بھی دی گئی۔ ایسی ہی ایک شادی تاشقند کے ایک موحد نوجوان کی تھی، ساڑھے پانچ سو کے قریب مہمان تھے، میوہ جات، پھل اور قہوہ سامنے رکھ دیا گیا اور پھر تقریریں شروع ہوگئیں، جلسے کے اختتام پر کھانا کھلایا گیا۔ مجھے یہاں ساتھیوں نے بتلایا کہ تین سال قبل یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ازبکستان میں شادی جیسے فنکشن پر کہ جس کا انعقاد شراب اور مخلوط ڈانس کے بغیر ناممکن تھا اس پر یوں جلسے ہونا شروع ہوجائیں گے۔

تاشقند کی ایک مسجد میں اہل توحید نوجوانوں کے درمیان:

وسط ایشیائی ریاستیں جب آزاد ہوئیں تو سعودی عرب کے ایک نوجوان عالم دین نے تاشقند میں ڈیرے جمالیے، مساجد میں انھوں نے دروس قرآن کا سلسلہ شروع کیا، نوجوان ان سے بڑے مانوس اور متاثر تھے، وہ واپس سعودی عرب گئے تو اب حکومت انھیں واپسی کی اجازت دینے میں تال مٹول سے کام لے رہی تھی۔ ایسی ہی ایک مسجد کہ جس میں شیخ درس دیتے تھے میں اس مسجد میں دعوتی درس دینے کے لیے پہنچ گیا، نماز مغرب کے بعد محلے کے پڑھے لکھے بہت سے نوجوان اکٹھے ہوگئے، اس درس میں میرا مترجم ترمذ کا ایک نوجوان تھا۔ جو کہ عربی بڑی اچھی جانتا تھا، اب میں نے اپنا درس بھی امام ابوعیسیٰ ترمذی کی حدیث سے شروع کیا۔

میرے بھائیو! دن میں آخری نماز عشاء کی نماز ہے، اس کے بعد انسان سونے کی تیاری کرتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کو ایسے موقع کے لیے ایک دعا سکھلائی اور فرمایا کہ اسے بستر پر لیٹتے وقت پڑھا کرو، پھر اگر تم رات کو فوت ہوگئے تو تمھاری

موت اسلام پر ہوگی اور اگر رات گزار کر صبح اٹھ کھڑے ہوئے تو صبح خیر سے ہوگی۔اب یہ دعا ملاحظہ فرمائیں:

« اَللّٰهُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِيْ اِلَيْكَ وَ وَجَّهْتُ وَجْهِيْ اِلَيْكَ وَ فَوَّضْتُ اَمْرِيْ اِلَيْكَ رَغْبَةً وَّ رَهْبَةً اِلَيْكَ لَا مَلْجَأَ وَ لَا مَنْجَأَ مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ اٰمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِيْ اَنْزَلْتَ وَ نَبِيِّكَ الَّذِيْ اَرْسَلْتَ »

''اے اللہ! میں نے اپنی جان تیرے حوالے کر دی اور اپنا رخ تیری طرف پھیر دیا اور اپنے کام کو تیرے سپرد کر دیا اپنی رغبت اور تیرے خوف سے، تیرے عذاب سے پناہ اور نجات کی جگہ کہیں نہیں ،مگر تیرے پاس...... میں تیری اتاری ہوئی کتاب پر اور تیرے بھیجے ہوئے رسول پر ایمان لایا۔''

ترمذی میں "رغبة اليك" کے بعد "والجات ظهری اليك" (یعنی میں نے اپنی پشت کو تیری پناہ میں دے دیا) کے الفاظ بھی آتے ہیں اور اس روایت میں یہ واقعہ بھی موجود ہے کہ حضرت براء رضی اللہ عنہ نے "وبنبيك الذی ارسلت" کی جگہ "وبرسولك الذی ارسلت" پڑھا تو حضرت براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر مارا اور فرمایا "وبنبيك الذی ارسلت" یعنی آپ نے اس بات کو نا پسند فرمایا کہ آپ کی بتلائی ہوئی دعا میں ''نبی'' کی جگہ ''رسول'' کا لفظ آئے۔غور فرمایئے! کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ایک لفظ کی تبدیلی کو کہ جس کے مطلب ومفہوم میں کوئی فرق نہیں ، اسے برداشت نہیں کیا تو اب جو لوگ قرآن وحدیث کے مسلک کی بجائے انسانوں کے نام پر مسلک بنائے پھرتے ہیں، اماموں کے اقوال کو نبی کی حدیث پر ترجیح دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو حنفی ہیں۔بتلایئے ! اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم انھیں سینے سے لگائیں گے یا کہ ان کے سینوں پر ہاتھ مار کر انھیں دھکے دیں گے؟ آپ کے ازبکستان کے شہر ترمذ کے رہنے والے امام ترمذی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث لائے ہیں وہ تو یہی کہتی ہے کہ پھر ایسے لوگوں کو دھکے ہی

پڑیں گے۔

میرے بھائیو! میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں کہ علم دو طرح کے ہیں، ایک وہ علم کہ جس میں کوئی شک وشبہ نہ ہو اور دوسرا وہ علم کہ جس میں صحیح اور غلط دونوں کا شبہ موجود ہو تو ان میں افضل اور اصل علم کون سا ہے؟ یقینا وہی علم کہ جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو، اس علم کی ہر بات صحیح ہے، وہ قرآن کا علم ہے اور حدیث کا علم ہے، اب جو علم حدیث کا امام ہو یعنی اس علم کا کہ جو اللہ کے رسول ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا ہے اور آپ ﷺ کی زبان سے دین کا علم اس وقت تک نہیں نکلتا جب تک کہ اللہ نکلواتا نہیں:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ (النجم: ۳-۴)

''اور وہ تو اپنی مرضی سے بولتے ہی نہیں سوائے اس وحی کے جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔''

تو......اب بتلایئے! جس کے پاس یہ علم ہو امام اعظم اسے کہنا چاہیے یا کہ اسے کہ جس کا حدیث پر ایک کتابچہ تک بھی نہ ہو؟ تو میرے بھائیو! یہاں کے لوگ کس قدر بدقسمت ہیں، امام اعظم ان کا اپنا ہے، وہ امام کہ جس نے وہ کتاب لکھی کہ جو قرآن کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب ہے، مگر یہ لوگ بخارا سے اسے جلاوطن کرتے ہیں، سمرقند کے قریب سوئے ہوئے اس امام کو بھلا دیتے ہیں اور لوگ ازبکستان سے ہزاروں میل دور جا پہنچے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو حنفی ہیں، امام ابو عیسیٰ ترمذی کو بھولے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو نقشبندی اور کرخی ہیں۔

مجھے بتلاؤ! پھر اس قوم کو دھکے نہ پڑیں تو اور کیا ہو۔

یاد رکھو! جو حدیث کا علم جانتا ہے وہی سب سے بڑا فقیہ ہے۔ امام یحییٰ بن شرف اپنی حدیث کی کتاب ''الاربعین النوویہ'' میں اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث لکھتے ہیں، آپ ﷺ فرماتے ہیں:

''میری امت میں سے اپنے دین کے معاملات میں سے جس نے چالیس حدیثیں حفظ کرلیں اللہ اس کو قیامت کے روز فقہاء اور علماء کے گروہ سے اٹھائے گا۔'' ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ''فقیہ اور عالم بنا کر اٹھائے گا۔''

اب غور فرمایئے! کہ اللہ کے رسول ﷺ کی نظر میں جو چالیس حدیثوں کا حافظ ہو وہ فقیہ ہے اور جو لاکھوں حدیثوں کا حافظ ہو بھلا وہ کتنا بڑا فقیہ ہوگا۔ امام بخاری کم بیش تین لاکھ احادیث کے حافظ تھے، امام ترمذی ایک لاکھ سے اوپر احادیث کے حافظ تھے۔ پھر امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں ابواب کی جو ترتیب مرتب کی ہے کہ سب سے پہلے قرآن کی آیت لاتے ہیں پھر باب کی مناسبت سے احادیث لاتے ہیں، ایک حدیث کو متعدد ابواب میں لاکر ثابت کرتے ہیں کہ اس سے فلاں فلاں مسائل ثابت ہیں، اب بتلایئے! امام کا یہ انداز فقیہانہ نہیں تو اور کیا ہے؟ یقین جانیے محدث سے بڑا فقیہ کوئی نہیں ہوتا ......لہذا...... دین چاہتے ہو، حق چاہتے ہو تو قرآن وحدیث کو اپنا مسلک بنالو۔

میں جب درس دے چکا تو سکولوں، کالجوں کے طلباء اور دوسرے نوجوان میرے گرد اکٹھے ہوگئے، کہنے لگے ہمیں پاکستان لے چلو، ہم پاکستان میں تعلیم حاصل کریں گے۔ ایک نوجوان میری طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگا وہ وقت بھی کیا خوب ہوگا جب میں پاکستان میں قرآن وحدیث کا علم سیکھنے جاؤں گا۔

ایک دیہاتی عورت ''دیماتن'' کا قصہ:

مجھے معلوم ہوا کہ امارات کے ایک عربی شیخ تاشقند میں دعوت وتبلیغ میں کچھ عرصہ سے مصروف کار ہیں، میں شیخ کا پتا معلوم کرکے ان کے گھر پہنچا، شیخ سے ملاقات اور بات چیت ہوئی اور پھر میں جب تک تاشقند میں رہا شیخ سے ملاقاتیں بھی جاری رہیں اور شیخ کے ساتھ دعوتی پروگراموں میں شمولیت بھی۔ تاشقند کی ایک مسجد میں شیخ نے درس دیتے ہوئے ایک بڑا دلچسپ واقعہ سنایا۔

اندلس (ہسپانیہ) کا ایک وزیر کہیں سفر کر رہا تھا کہ ایک گاؤں کے قریب نہر پر سے گزر ہوا جہاں عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں، وزیر کے ہم سفر ساتھیوں میں ایک شاعر بھی تھا، اس نے عربی شعر کا ایک مصرعہ پڑھا اور وہ پہلا مصرعہ سنتے ہی دیہاتی عورت نے بے ساختہ اس کے ساتھ دوسرا مصرعہ ملا ڈالا، وزیر یہ سن کر اس دیہاتی عورت کی ذہانت پر متعجب و متحیر ہوا، اتفاق سے دیہاتن کہ جس کا نام دیماتن تھا، حسن و جمال بھی اس پر فریفتہ تھا۔ چنانچہ وزیر نے اس عورت سے شادی کر لی۔ اب گاؤں کی رہنے والی دیہاتن شہر کی باسن بن گئی، کچی کٹیا میں رہنے والی دیماتن محل کی مالکن بن گئی۔ مگر شہر کی رنگینیاں اور محل کی دل فریبیاں اس دیہاتن کے دل سے گاؤں کی زندگی کی یادیں مٹا نہ سکیں، وہ چھپروں پہ جانا، وہاں سے مٹی لانا، اس مٹی کو ہاتھوں اور پاؤں سے بنانا سنوارنا اور پھر اپنی کٹیا کی لیپا پوچی کرنا، نہر اور نالے پر جا کر ہمجولیوں کے ہمراہ کپڑے دھونا، وہ صبح صبح سادہ سا کھانا تیار کرنا، اسے اپنے سر پہ سجانا اور گاؤں سے دور اپنے بھائی کے لیے لے کر جانا کہ جو فجر ہوتے ہی زمین میں ہل چلانے چل دیتا تھا۔ غرض گاؤں کی زندگی کے یہ مناظر دیہاتن کو یاد آتے تو وہ محل میں اداس ہو جاتی، سنگ مرمر کا فرش، شیشوں کا جڑاؤ، ہیروں کے چکاچوند سجے ہوئے پلنگوں کے آراستہ و پیراستہ نرم و گداز بستر گویا کبھی کبھار تو اسے کھانے کو آتے۔ چنانچہ ایک روز اس نے محل کے صحن میں مٹی کو اکٹھا کیا، اس میں پانی ڈالا، کیچڑ بنایا اور پھر اس میں داخل ہو کر اپنی عادت پوری کرنے لگی۔ اب اس کا شوہر بھی محل میں آدھمکا، بیوی کو کیچڑ میں لت پت دیکھ کر بھونچکا رہ گیا، بیوی سے پوچھنے لگا یہ کیا؟ اس نے کہا گاؤں کی زندگی کو ترس گئی ہوں، اسی لیے آج اپنی عادت پوری کرنے کو دل چاہا ہے۔ اس پر وزیر نے بیوی کو کیچڑ سے نکالا اور کہا میں تیری عادت پوری کرتا ہوں ...... اور پھر محل کے ایک خوبصورت کمرے میں زعفران، کستوری اور دیگر خوشبودار چیزوں کو ملا کر گارا بنایا اور اسے محل کے ایک خوبصورت ہال میں پھیلا دیا اور کہا کہ اب یہاں عادت پوری کر لو۔

دن گزرتے گئے، ایک روز میاں بیوی میں کسی بات پر جھگڑا ہوگیا تو بیوی شوہر سے کہنے لگی جب سے اس دکھوں بھرے گھر میں آئی ہوں سکھ کا سانس نہیں لیا۔ اس پر وزیر نے اسے احسانات گنوانے شروع کردیے اور آخر پر کہا:

''اس دکھوں بھرے گھر میں وہ دن بھی یاد کر کہ جب میں نے زعفران اور کستوری کا گارا بنا کر محل میں پھیلا دیا۔''

اس پر دیماتن کو شرمندگی کا احساس ہوا۔

امارات کے عرب عالم دین یہ واقعہ بیان کر کے فرمانے لگے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے عورتوں کی اسی فطرت کی بنا پر کہ وہ شوہروں کی احسان فراموشی کرتے ہوئے معمولی بات پر بھی ساری زندگی کے احسانات کو پل بھر میں بھلا کر ناشکری پر آجاتی ہے، ان کے بارے میں فرمایا:

''مجھے جہنم دکھلائی گئی تو اس میں اکثریت عورتوں کی تھی (سبب یہ ہے کہ) وہ کفر کرتی ہیں۔ پوچھا گیا کہ وہ اللہ کے ساتھ کفر کرتی ہیں؟ فرمایا وہ خاوندوں کے احسانات کی ناشکری کرتی ہیں اگر تو ان میں سے کسی پر زندگی بھر احسان کرتا رہ پھر کبھی وہ تیری جانب سے کوئی معمولی سی بات دیکھے تو کہہ اٹھے گی:

((مَا رَأَیْتُ مِنْکَ خَیْرًا قَطُّ)) (بخاری)

''میں نے تو تجھ سے کبھی کوئی خیر دیکھی ہی نہیں۔''

حقیقت اور بے عملی:

شیخ نے دوسرا اہم نکتہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہم آج دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں میں عمل مفقود ہے، بے عملی کی انتہا ہوچکی ہے اور آپ حیران ہوں گے کہ اس بے عملی کا سب سے بڑا سبب حنفی مذہب ہے، اس مذہب کے مطابق ایمان گھٹتا اور بڑھتا نہیں، سب کا ایمان ایک

جیسا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان اور ہمارے ایمان میں کوئی فرق نہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ مومنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب قرآن کی کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو:

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِيمَانًا ﴿١٢٤﴾ (التوبة: ١٢٤)

''تو یہ لوگ جو ایمان لائے ہیں ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔''

اسی طرح امام بخاری نے بخاری شریف میں ''ایمان کا بڑھنا اور گھٹنا'' کے نام سے باب باندھ کر اللہ کے رسول ﷺ کی حدیثوں سے بھی ثابت کیا ہے کہ ایمان گھٹتا اور بڑھتا ہے مگر حنفی مذہب کے نزدیک کوئی شخص نیک ہو یا فاسق دونوں کے ایمانی وزن میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب جب حنفیت کا یہ اصول ٹھہرا تو نتیجہ یہ سامنے آیا کہ اکثر لوگ حنفی المسلک ہو گئے کیونکہ اس مذہب میں آسانی تھی کہ عمل کرو نہ کرو سب کا ایمان یکساں ہے اور یہ کہ ایمان نہ نیکی کرنے سے بڑھتا ہے اور نہ گناہ کرنے سے کم ہوتا ہے۔ چنانچہ آج مسلمانوں کی اکثریت بے عمل ہے جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے قرآنی آیات اور احادیث رسول ﷺ سے ثابت کیا کہ نیکی کرنے سے ایمان بڑھتا اور گناہ کرنے سے کم ہوتا ہے۔ شیخ صاحب کا خطاب اور انداز بیان بڑا موثر تھا، نوجوان بڑے ذوق شوق سے سن رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بوڑھوں کی نسبت نوجوان نسل کو جوں جوں معلوم ہو رہا ہے وہ دین کے اصل ماخذ وں قرآن وحدیث کی طرف پلٹ رہے ہیں، بخاری اور مسلم کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس سے اپنا دین معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایک روز میں نے بھائی فتح اللہ سے پوچھ لیا کہ بخاری کا ازبکی زبان میں ترجمہ موجود ہے کہ نہیں؟

اس پر مجھے فتح اللہ نے بتلایا کہ موجود ہے اور اس کی ایک جلد میرے پاس بھی پڑی ہے۔ اب میں نے وہ جلد منگوائی تو اس میں اصل متن نہ تھا، عربی زبان میں فرامین

رسول ﷺ نہ تھے بلکہ محض روسی رسم الخط کے ساتھ ازبکی زبان میں ترجمہ تھا اور اس ترجمے کے بارے میں فتح اللہ نے بتلایا کہ اس میں بھی اس طرح سے گڑبڑ کی گئی ہے کہ جس جگہ حنفی مسلکوں پر حدیث کی زد اور ضرب پڑتی ہے تو ان مسائل کے بارے میں بریکٹ (قوسین) لگا کر لکھ دیا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ شافعیوں کے ہاں اس طرح ہے جبکہ احناف کے ہاں اس طرح ہے۔تو یوں حدیث رسول ﷺ کو شافعیت کی طرف منسوب کر کے مقابلے میں حنفیت کو ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ذرا غور کیجیے! کس قدر فریب، ناانصافی اور ظلم ہے جو امام بخاری کے دیس میں بخاری شریف کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔بہر حال صورتحال یہ ہے کہ یہ کتاب بھی جو کچھ عرصہ قبل سرکاری مفتیوں کی طرف سے شائع ہوئی تھی اب نہیں ملتی یعنی بازار سے لوگوں نے جوق در جوق خریدی ہے۔اب لوگوں نے تو بخاری شریف خریدی ہے مگر انھیں کیا پتا کہ گڑ کے ساتھ زہر ملا کر دیا جا رہا ہے اور یہ ظلم حنفی مولویوں نے اس لیے کیا ہے کہ اگر ہم حدیث کی مخالفت اور اس کے مقابلے میں حنفی مذہب لکھیں گے تو لوگ مسترد کر دیں گے، چنانچہ انھوں نے حدیث رسول ﷺ کے مسئلے کو شافعیت کا لبادہ اوڑھایا اور پھر اس کے مقابلے میں اپنا حنفی مسئلہ کھڑا کر دیا اور لوگوں کو بتلایا کہ جب تم حنفی ہو تو حنفی مسئلے پر عمل پیرا ہو جاؤ۔(نعوذ باللہ من ذلک)

یہودیوں کے عبادت خانے میں:

ایک روز ٹکٹ کے سلسلے میں مجھے تاشقند ایئر پورٹ پر جانا ہوا، وہاں بڑا رش تھا، ایک مسافر سے پوچھا کہ فلائٹ کہاں جا رہی ہے تو بتلایا گیا کہ اسرائیل۔اسرائیل کے نام سے حیرانی ہوئی مگر پھر یہ حیرانی دور ہوگئی جب پتا چلا کہ یہاں تو ہر ہفتے پرواز جاتی ہے اور ازبکستان کے یہودی دھڑا دھڑ اسرائیل جا رہے ہیں۔

اب میں نے سوچا کہ کیوں نہ یہودیوں کے عبادت خانے میں جایا جائے تاکہ ان کا عبادت خانہ دیکھا جائے۔چنانچہ ہم تاشقند میں ان کے عبادت خانے میں چلے گئے، معبد

کے مربی سے ہم نے اپنا مدعا بیان کیا اور پھر وہ ہمیں اپنا عبادت خانہ دکھلانے لگا۔ بت پرستی یہاں عروج پر تھی، ان کے بزرگوں اور ولیوں کی تصاویر موجود تھیں، تورات کا نسخہ بھی موجود تھا۔ میں نے مربی سے اس کی تحریف و تبدیلی اور شرک و اولیاء پرستی پر بات کی، عزیر علیہ السلام کے بارے کہا کہ آپ انھیں اللہ کا بیٹا مانتے ہیں جبکہ یہ عقلی اور نقلی طور پر فضول بات ہے۔ مربی کہنے لگا یہ کیسے؟ میں نے کہا جب اللہ کا بیٹا ایک انسان ہوگیا تو بیٹے میں بھی باپ والی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اب اس طرح تو سارے انسان رب ہو گئے، پھر تم مجھے بتلاؤ! یہاں عبادت کس کی کرتے ہو؟ اس پر مربی کو کوئی جواب نہ آیا تو بس اتنا کہہ سکا کہ ہماری تورات میں ایسا ہی لکھا ہے۔ میں نے کہا وہ تم نے بدل لیا، خود تمھارے ہاں اس کے کتنے ایڈیشن ہیں اور ہر ایڈیشن دوسرے سے مختلف ہے، تو اس کا کیا اعتبار کیا جائے؟ اس پر کہنے لگا آپ ہفتے کے دن آنا، ہماری عبادت بھی دیکھنا اور گفتگو بھی ہوگی۔ میں نے کہا کوشش کروں گا مگر شاید نہ آسکوں، بہر حال آپ سے یہ ضرور کہتا ہوں کہ ہماری کتاب قرآن کا مطالعہ کرنا، شاید عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی طرح آپ کی بھی قسمت میں اسلام جیسا دین حق ہوجائے۔

تاشقند سے جب ہم واپس شہر سے دور فتح اللہ کے گاؤں جانے لگے تو کوئی ٹیکسی نہیں مل رہی تھی، اتفاق کی بات ہے کہ ایک ادھیڑ عمر عورت نے ہمارے قریب آکر بریک لگائی۔ اب ہم گاڑی میں بیٹھ گئے، میں نے اس عورت سے اس کا مذہب پوچھا تو کہنے لگی میں یہودن ہوں۔ میں نے کہا تم اپنی کتاب تو پڑھتی ہوگی؟ کہنے لگی ہاں! میں نے کہا آپ کا تو یہی خیال ہوگا کہ یہودیت ہی سچا مذہب ہے؟ کہنے لگی کیوں نہیں؟ اس پر میں نے کہا دوسرے مذاہب کا بھی مطالعہ کریں تو شاید حق کہیں اور سے نکل آئے اور ساتھ ہی میں نے سوال کر دیا کہ انجیل پڑھی ہے؟ کہنے لگی ہاں پڑھی ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ پھر تو مسلمانوں کا قرآن رہ گیا اس کا بھی مطالعہ کرلو؟ کہنے لگی مطالعہ کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے کہا وہ کیوں؟ کہنے لگی ہم میں اور آپ میں فرق ہی کیا ہے؟ میں نے کہا وہ کیسے؟ کہنے لگی آپ بھی جھٹکے والا گوشت نہیں

کھاتے، ذبیحہ کرتے ہیں جبکہ ہم بھی ذبیحہ کھاتے ہیں۔اسی طرح تم بھی ختنہ کرتے ہو ہم بھی ختنہ کرتے ہیں۔میں نے اسے کہا چلو! یہ باتیں تو مشترک ہوگئیں جبکہ توحید اور رسالت میں ہمارے تمھارے درمیان اختلاف ہے، وہ اختلاف بنیادی ہے، اس اختلاف میں حق کس کے پاس ہے اس کا پتا تبھی چلے گا جب آپ تورات اور انجیل کے بعد ہمارے قرآن کا مطالعہ کریں گی اور پھر اس پر میں نے بہت زیادہ زور لگا دیا، ادھر ہمارا گاؤں بھی آ چکا تھا اور وہ بھی بالآخر اس بات پر آ ہی گئی تھی کہ اچھا اب قرآن بھی پڑھوں گی اور پھر میں نے اسے (۸۰) روبل کے بجائے (۱۰۰) سو روبل ہی ادا کر دیے۔

میرا کام دعوت اور اس کے لیے تالیف قلب تھا سو اللہ کی توفیق سے مختصر وقت میں جو ممکن تھا وہ میں نے کر دیا جبکہ ہدایت دینا اللہ کے اختیار میں ہے۔

وادیٔ فرغانہ:

وسط ایشیا کی پانچ ریاستوں میں سب زیادہ دینی بیداری ازبکستان میں ہے۔چنانچہ آج ۲۸ اگست کو ہمارا پروگرام وادیٔ فرغانہ کی جانب تھا، رات ساڑھے نو بجے ہم ریل میں بیٹھے، ہم تین ساتھی تھے جبکہ بھائی فتح اللہ کے بیوی بچے بھی اس کے ہمراہ تھے۔چنانچہ ہم نے پورا کیبن بک کرانے کا فیصلہ کیا مگر دو کیبنوں میں دو دو برتھ ملے۔ایک کیبن میں ہم بیٹھے، اس میں ایک روسی تھا اور دوسرا اس کا ساتھی۔ہم نے روسی سے کہا کہ آپ دونوں ساتھ والے کیبن میں چلے جائیں۔وہ نہ مانے تو بھائی فتح اللہ اور میں نے اسے سمجھایا مگر وہ نہ مانا بلکہ الٹا دھمکیاں دینے لگا اور فتح اللہ کے چھوٹے بچے کو اٹھا کر وہاں لیٹنے لگا۔اب فتح اللہ بھی عقیدۂ توحید کا حامل ازبکی نوجوان تھا، اس نے اسے کمرے سے نکال باہر کیا اور کہا کہ تم روسی ہمارے ساتھ ایسا ہی کرتے آئے ہو، اب ہم تمہیں مزہ چکھائیں گے، ہمارے علاقے میں ہمیں پر رعب جماتے ہو، میں تیری تکہ بوٹی کردوں گا۔اس پر روسی گھبرا گیا اور دوسرے کیبن میں چلا گیا۔روسی باشندے شہروں میں کافی تعداد میں ہیں اور اچھی پوسٹوں پر بھی۔تاشقند

میں بہت زیادہ روسی ہیں مگر اب یہ لوگ گھبرا رہے ہیں، گھبراتے اس لیے ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کے حقوق چھینے ہیں، ان کی جائدادوں پر قبضہ کیا ہے، اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے ان پر بند کیے ہیں اور اب جبکہ یہاں کے مقامی مسلمان قدرے آزاد ہوئے ہیں، اسلامی بیداری ان میں پیدا ہونا شروع ہوئی ہے تو روسی گھبرا رہے ہیں اور کئی ایک تو واپس ماسکو کی راہ لے رہے ہیں۔

گاڑی چل رہی تھی، آدھی رات ہوچکی تھی، فتح اللہ نے مجھے جگایا اور کہا "فرغانہ" آگیا ہے۔ یہاں گاڑی کافی دیر رکی ۔ہاں تو یہ وہی شہر ہے جہاں ظہیر الدین بابر پیدا ہوا تھا، تیموری نسل کا یہ اوزبک نوجوان جس کی اولاد ہندوستان میں شاہان مغلیہ کہلوائی، اس نے دریائے آمو پار کیا اور افغانستان سے ہوتا ہوا ہندوستان آیا۔ یہاں اس نے پانی پت کے میدان میں ہندوؤں کو عبرت ناک شکست دی۔ ایودھیا کو جب فتح کیا تو فتح کی یاد میں یہاں ۱۵۲۸ء میں مسجد تعمیر کروائی، ہندوؤں نے مسلمانوں کی اس جہادی یادگار بابری مسجد کو چھ دسمبر ۱۹۹۲ء کے روز منہدم کر کے وہاں مندر بنادیا ہے۔آہ ! کہ جہاں مرکز توحید تھا وہاں اب شرک کا گڑھ بن گیا، جہاں الہ واحد کی عبادت ہوتی تھی وہاں اب مورتیوں کی پوجا ہونے لگی، جہاں قرآن وحدیث کی آوازیں گونجتی تھیں وہاں اب بھجن گائے جانے لگے ......ایسا کیوں؟ سیدھی اور صاف بات یہی ہے کہ جب مسلمانوں نے جہاد چھوڑا تو ان کی جہادی یادگار کو ڈھا کر مندر بنا دیا گیا۔قرآن کہہ رہا ہے کہ:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٤٠﴾ (الحج: ٤٠)

"اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا (مشرکوں کا غلبہ نہ روکتا) تو

خانقاہیں اور گرجے، یہودیوں کے عبادت خانے اور مسجدیں کہ جن میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے، یہ سب گرا دی جاتیں۔ (اور یاد رکھو!) جو کوئی اللہ کی مدد کرے گا (جہاد کرے گا) تو اللہ اس کی مدد کرے گا (اسے غلبہ دے گا) بلاشبہ اللہ زور آور، غلبے والا ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ بڑا فضل وکرم ہے کہ اس نے ہر زمانے میں مشرکوں کو روکا اور انبیاء اور مومنوں کو قتال کرنے کی اجازت اور حکم دے کر ان کا دفاع کیا، اگر وہ ایسا نہ کرتا تو یہ مشرک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہودیوں کے عبادت خانے کو، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں گرجوں اور خانقاہوں کو اور اب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسجدوں کو مسمار کر ڈالتے۔

چنانچہ آج جہاد چھوڑا اور بابری مسجد ڈھا دی گئی، جہاد چھوڑا اور ''فرغانہ'' روسیوں کے نرغے میں ستر سال تک کراہتا رہا اور پھر افغانستان میں جہاد ہوا اور محض اس کی گرمی سے ہی فرغانہ روسیوں کے نرغے سے نکل آیا اور آج امیر حمزہ ''فرغانہ'' کو دیکھ رہا ہے تو یہ جہاد کی برکت سے دیکھ رہا ہے۔ بابر کی جنم بھومی سے اب گاڑی چل چکی تھی، رات کا آخری نصف حصہ بھی مسافت میں طے ہو چکا تھا، صبح کے سات بج رہے تھے، اب ہم وادیٔ فرغانہ کے سب سے بڑے شہر ''اندجان'' میں تھے۔

دین کی جان......شہر اندجان:

آج سے دو سال قبل جب روس ٹوٹ رہا تھا، گوربا چوف جا رہا تھا، یلسن آ رہا تھا تو ان دنوں نوائے وقت کی جانب سے عطاء الرحمٰن، غالباً پاکستان کے پہلے صحافی تھے جو روس گئے اور وہاں سے خبریں جمع کر کے بھیجتے رہے اور وہ نوائے وقت کی زینت بنتی رہیں۔ عطاء الرحمٰن صاحب جب واپس آئے تو محترم عبدالجبار شاکر ڈائریکٹر پبلک لائبریریز پنجاب کی وساطت سے میں جناب عطاء الرحمٰن سے ملا تو انھوں نے مجھے کہا کہ روس جائیں تو ازبکستان میں واقع

وادیٔ فرغانہ میں جانا نہ بھولیں اور نمنگان اور اندجان میں تو ضرور جائیں۔ میں نے کہا کیوں؟ وہاں کیا خاص بات ہے جو ضرور جاؤں؟ تو کہنے لگے آپ کو وہاں کتاب وسنت کے حاملین راسخ العقیدہ لوگ ملیں گے، ان سے مل کر آپ کو یقیناً خوشی ہوگی۔

اب میں اندجان شہر کے وسط میں مرکزی مسجد اور مدرسے میں تھا، مسجد اور مدرسہ اڑھائی تین ایکڑ رقبے پر مشتمل ہے، مسجد اور مدرسے کی عظیم تاریخی عمارت کہ جسے کمیونسٹوں نے کارخانے میں بدل دیا تھا، یہاں لوہے کا کام ہوتا تھا مگر اب یہاں لوہے اور ہتھوڑے کی آوازوں کی بجائے اس مسجد کے مینار سے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوتی ہیں جبکہ طلباء کی کلاسوں میں قال اللہ وقال الرسول ﷺ کی ایمان افروز تعلیم دی جاتی ہے۔ مدرسہ ابھی حال ہی میں کھلا ہے، روس کے مختلف علاقوں سے یہاں ڈیڑھ صد کے قریب طلباء موجود ہیں۔ مدرسے کے رئیس شیخ عبدالولی ہیں جبکہ نائب رئیس اور جامع مسجد کے امام وخطیب شیخ عبد الغفور صاحب ہیں۔ میں نے شیخ عبدالغفور سے ان کے کمرے میں ملاقات کی، عبدالغفور صاحب چالیس سال کی عمر کے نوجوان عالم دین ہیں، عربی زبان بڑی روانی سے بولتے ہیں، ان کی گفتگو میں مٹھاس، دین کا خلوص اور للّٰہیت کی خوشبو آ رہی تھی۔ شیخ صاحب جب خطبہ جمعہ دیتے ہیں تو اندجان کی مرکزی مسجد میں سات ہزار کے قریب نمازی خطبہ سنتے ہیں۔ سورۂ فاتحہ کے بعد جب امام "ولاالضالین" کہتے ہیں تو مسجد کے درودیوار "آمین" سے گونج اٹھتے ہیں۔ یہاں ظہر اور عصر کی نمازوں کے اوقات میں ڈیڑھ سے اڑھائی ہزار کے قریب نمازی ہوتے ہیں، پھر ان دونوں نمازوں کے بعد قرآن وحدیث پر مشتمل مختصر درس دیے جاتے ہیں۔ یہ درس سننے کے لیے لوگ اردگرد کے دیہات سے یہاں ظہر کی نماز پڑھنے آتے ہیں۔

اس علاقے میں کتاب وسنت کی خوشبو کیسے پھیلی، جب میں نے اس کے بارے پوچھا تو پتا چلا کہ ترکستان کا وہ علاقہ جو اس وقت چین کے قبضے میں ہے، اس کی سرحدیں تاجکستان

اور تاز قستان سے ملتی ہیں اور درۂ خنجراب پر اس کی سرحد پاکستان کے علاقے گلگت سے ملتی ہے، شاہراہ ریشم چینی ترکستان اور پاکستان کو ملاتی ہے تو اس علاقے کو چین کے کمیونسٹوں نے ''سنکیانگ'' کا نام دے رکھا ہے۔ اس کا دارالحکومت ''کاشغر'' کا وہ تاریخی شہر ہے جسے حضرت قتیبہ بن مسلم رحمہ اللہ نے فتح کیا تھا، اس شہر ''کاشغر'' کا ایک عالم قاسم خواجہ چینی کمیونسٹوں کے ظلم سے تنگ آکر ازبکستان آگیا اور وہ یہاں قرآن وحدیث کی تعلیم چھپ چھپا کر لوگوں کو دیتا رہا۔ شیخ عبدالولی جو اندجان کے مدرسہ کے مہتمم ہیں، وہ اسی شیخ کے شاگرد ہیں۔ شیخ کے ایک اور شاگرد رحمت اللہ بن قادر تھے، یہ شیخ عبدالولی کے ہم جماعت تھے، عبدالغفور صاحب کہنے لگے وہ اس قدر قرآن وحدیث کے عالم و عامل تھے کہ انھیں استاذ الاساتذہ کہنا چاہیے، وہ دلیر اور بہادر تھے، اندجان کے رہنے والے تھے اور مرغلان میں انھوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ کمیونسٹ اب ان کی دلیرانہ دینی سرگرمیوں سے واقف ہو چکے تھے چنانچہ ان ظالموں نے اس موحد عالم کو شہید کر دیا، اب انھیں کے ساتھی شیخ عبدالولی اندجان کے مدرسہ میں کتاب وسنت کا چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔

شیخ عبدالغفور اور ان کے ساتھی اساتذہ نے ہمارے ساتھ بڑی محبت کا اظہار کیا، ضیافت کی اور آخر پر مجھے خنجروں کا تحفہ دیا اور پاکستان کے اہل توحید علماء کے ساتھ رابطوں اور ملاقاتوں پر زور دیا۔

مدرسے سے فارغ ہو کر میں حسب وعدہ ریلوے آفیسر کے گھر گیا کہ جس کے ہمراہ ہم نے آستراخان سے سمرقند تک سفر کیا تھا، ہم اب اس کے گھر پہنچے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا، روایتی شاندار ضیافت کرنے کے بعد اس نے کہا میں اپنے بیٹوں کو علماء بنانا چاہتا ہوں، میرا ایک بیٹا آپ پاکستان لے جائیں، وہاں دینی تعلیم دیں، میں نے اسے دین کے لیے وقف کر دیا ہے۔

نمنگان:

وادیٔ فرغانہ کے اس شہر میں اندجان کی نسبت دینی بیداری کچھ زیادہ ہی دیکھنے کو ملی، اس شہر کی مرکزی مسجد اور مدرسہ جو دو ایکڑ اراضی پر مشتمل ہوگا، کتاب وسنت کا مرکز ہے۔ میں جب ظہر کے وقت مسجد میں پہنچا تو اہل توحید کی یہ مسجد کہ جسے گنبز والی مسجد کہا جاتا ہے، وہاں ایک ہزار کے قریب نمازی تھے، نوجوانوں کے گورے اور چوڑے چپٹے چہروں پر سیاہ داڑھیاں دیکھ کر دل بڑا خوش ہوا اور جب عشاء کی نماز میں مسجد ''آمین'' کی آواز سے گونجی تو دل باغ باغ ہوگیا۔

نمنگان میں دعوت وتبلیغ:

جب میں نمنگان میں پہنچا تو تاشقند سے آئے ہوئے عرب امارات کے شیخ بڑا خوش ہوئے۔جامعہ کے مہتمم اور مسجد کے خطیب شیخ عبدالاحد سے میرا تعارف کروایا گیا۔اب ہم اکٹھے شیخ عبدالاحد کے گھر میں پہنچ گئے۔آج کئی ایک پروگراموں میں ہمیں شامل ہونا تھا۔ نمنگان کے ایک تاجر نے دعوت کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ہم وہاں پہنچے، کھانا کھایا اور پھر دین کی دعوت پیش کرنے لگے، سب لوگ ہمہ تن گوش تھے۔

رات کو ایک شادی میں شامل ہوئے، دعوت ولیمہ کے بعد دعوتی خطاب شروع ہوگئے، لوگ گھر کے وسیع وعریض صحن میں اس قدر کثرت سے آئے تھے کہ تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی، عورتوں کے لیے الگ بندوبست کیا گیا تھا۔

رات ہم نے شیخ عبدالاحد کے گھر میں گزاری، صبح کی نماز سے فارغ ہوئے تو درس کے لیے مجھے کہا گیا چنانچہ میں نے درس دیا اور شیخ عبدالاحد نے میری عربی تقریر کا ازبکستانی زبان میں ترجمہ کیا۔شیخ عبدالاحد تقریباً ۳۵ سالہ نوجوان عالم دین ہیں، عربی زبان بڑی اچھی اور روانی سے بولتے ہیں۔میں اگلے دن جب ان سے رخصت ہونے لگا تو وہ کہنے لگے رابطوں کو نہیں بھولنا، آپ کے اور ہمارے درمیان علماء کی آمد ورفت جاری رہنی چاہیے۔ اندجان

میں شیخ عبدالغفور صاحب نے بھی یہی بات کہی تھی اور اب شیخ عبدالاحد بھی یہی بات کہہ رہے تھے کہ ستر سالہ آہنی پردوں کے خاتمے کے بعد اب مسلمانوں، خاص طور پر علماء کا یہاں آنا اور دینی معاملات میں ہماری راہ نمائی کرنا بہت ضروری ہے۔

اندجان سے نمنگان جاتے ہوئے راستے میں اور نمنگان شہر میں کئی جگہ عربی رسم الخط میں بورڈ ملاحظہ کیے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو روسی رسم الخط سے کس قدر نفرت اور عربی رسم الخط سے کس قدر محبت ہے۔ اسی طرح عربی کے ساتھ ان لوگوں کی محبت کی دوسری بڑی دلیل یہ ہے کہ یہاں مدارس کے طلباء اور دوسرے عام لوگوں میں بھی عربی بولنے والے آپ کو مل جائیں گے جبکہ انگریزی بولنے والا بڑی مشکل سے ہی کوئی ملے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پوری دنیا کے مسلمانوں کی زبان عربی ہونی چاہیے، انگریز جہاں گئے انھوں نے وہاں انگریزی کو ٹھونسا، روسی جہاں گئے انھوں نے زبردستی ہر ایک کو روسی زبان کی تعلیم دی۔ مگر مسلمانوں کے ملک ہیں اور خود ہمارا پاکستان کہ جس کی بنیاد ''لا الہ الا اللہ'' ہے اور آج کل وہ لسانی مصیبتوں کا شکار بھی ہے تو کیا ہی اچھا ہو اگر اس ملک کی سرکاری زبان عربی ہوجائے۔ اسی طرح ہمارا دین دار طبقہ اپنے بچوں کو عربی بولنا سکھائے۔ ہم سے تو مشرق بعید کا مسلمان بلکہ برونائی ہزار درجہ بہتر ہے کہ جس نے حال ہی میں برطانیہ سے آزادی حاصل کی ہے اور اس کے وزیر تعلیم نے اپنے ملک میں عربی زبان کو سرکاری زبان قرار دیا ہے۔ عربی جبکہ ہمارے پیارے رسول کی زبان ہے، قرآن کی زبان ہے اور جنت میں بھی یہی زبان ہوگی تو ہمیں اس زبان کو محبت کے ساتھ سیکھنا اور اس پر فخر کرنا چاہیے۔

دوبارہ تاشقند میں:

یکم ستمبر کو تاشقند واپس پہنچا تو ازبکستان کے پہلے یوم آزادی کا دن منایا جا رہا تھا۔ تاشقند شہر میں جگہ جگہ رقص وسرود کی محفلیں بپا تھیں، وڈکا شراب اڑائی جا رہی تھی۔ ازبکستان کے صدر اسلام کریموف نے جہاں بیٹھ کر توپوں کی سلامی لی وہاں بھی ثقافتی طائفے ناچ رہے

تھے۔کھیل کود جاری تھی ۔اس موقع پر صدر نے تقریر بھی کی ۔رات کو صدر کی تقریر اور جشن آزادی پر تبصرے کے لیے سرکاری مولوی ٹیلی ویژن پر براجمان ہوئے۔ ایک مولوی غلام نبی آکر کہنے لگا ہمارے صدر کا نام بھی اسلام ہے اور اسلام کریموف نے جب پہلے یوم آزادی پر پہلی تقریر کی تو آغاز بسم اللہ سے کیا اور یہ بسم اللہ ''مفتاح الجنۃ'' جنت کی چابی ہے۔ اسی طرح نائب مفتی ذاکر کہنے لگا اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث ہے''حب الوطن من الایمان'' وطن کی محبت ایمان سے ہے تو ہمارے صدر نے وطن کی محبت میں جو فقید المثال جشن منایا ہے یہ اسلام کا تقاضا ہے۔

قارئین کرام! یہ باتیں سن کر میں تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا، یا اللہ! یہ مفتی ہیں جو اللہ کے رسول ﷺ کی طرف جھوٹ منسوب کیے چلے جا رہے ہیں، جھوٹی باتوں کو حدیث کہہ رہے ہیں۔ اسلام کریموف جو کہ سابق کمیونسٹ سیکرٹری ہے اور اب روسیوں کے جانے کے بعد وہ صدر بن بیٹھا ہے محض اس کی خوشنودی کے لیے اور اپنی نوکری کو پکا کرنے کے لیے کس قدر احمقانہ باتیں کر رہے ہیں۔

یاد رہے! موجودہ حکومت جو کہ روسی کمیونسٹوں کی یادگار ہے، مسلمان ان سے اور ان کے سرکاری مولویوں سے سخت نفرت کرتے ہیں ۔تاشقند کی ایک دعوت ولیمہ میں جہاں ایک ہزار کے قریب لوگ تھے، وہاں علماء کی تقریریں ہونے لگیں تو یہ سرکاری مولوی غلام نبی بھی وہاں موجود تھا، یقین جانیے! جب اس نے تقریر شروع کی تو میرے اردگرد بیٹھے لوگوں نے انتہائی نفرت کا اظہار شروع کر دیا...... اور جب تاشقند کی ایک مرکزی مسجد کے خطیب عابد خان نے تقریر کی اور افغان جہاد کے لیے ایک دو جملے بولے تو فضا نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھی اور لوگ زار و قطار رونے لگے۔

اس کے بعد میں نے اس نوجوان خطیب کے پیچھے جمعہ کی نماز پڑھی، دوران خطبہ مجھے اتنی سی سمجھ آئی کہ وہ بدعات کے رد اور سنت کی اہمیت پر زور دے رہے ہیں۔ بعد میں ان

سے ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی تو میری بات کی انھوں نے تصدیق کی۔ ان کی لائبریری صحاح ستہ، امام ابن تیمیہ، شیخ ابن باز اور شیخ عثیمین کی کتابوں سے آراستہ تھی، تاشقند شہر میں عابد خان جیسا اچھا خطیب کہیں نہیں ہے۔

اسی روز جمعہ کے دن میں اگلے وقت تاشقند کی مسجد ''طلا شیخ'' میں گیا، وہاں کے خطیب سے ملاقات کرنا چاہی تو پتا چلا وہ تو نکاح پڑھا رہے ہیں۔ نکاح کے بعد خطیب صاحب اپنے دفتر کے دروازے پر آئے اور مجھے اندر بلالیا، میں بیٹھ گیا مگر نکاح کے لیے متواتر جوڑے آرہے تھے، خطیب صاحب نکاح پڑھا رہے تھے اور فیس وصول کر رہے تھے اور ہر ایک کی ویڈیو فلم بھی بن رہی تھی اور ظلم یہ تھا کہ دلہن تقریباً نیم عریاں لباس میں ہوتی تھی۔ میں نے اس پر خطیب صاحب کو سمجھایا اور انھیں بتلایا کہ دلہنوں کا اس طرح سے نیم عریاں لباس میں آپ کے پاس مسجد میں آنا ٹھیک نہیں ہے، دلہن کے ولی کا آنا ہی کافی ہے۔ اس پر مولوی صاحب کہنے لگے ہمارے ہاں دین نہ ہونے کی وجہ سے اسی طرح سلسلہ چلتا آرہا ہے، بہرحال اب (ان شاء اللہ) میں اس کی اصلاح کروں گا۔ یہ سرکاری مولوی (داملہ) تھے۔

وطن واپسی اور تاشقند میں فوٹوسٹیٹ مشین کا نہ ملنا:

اب میرا واپسی کا پروگرام تھا چنانچہ ٹکٹ ''اوکے'' کروانے کے لیے ایئر پورٹ گیا تو پتا چلا کہ حزب اسلامی کے حکمت یار نے حکومت حاصل کرنے کے لیے کابل پر حملہ کر دیا ہے، اس لیے پی آئی اے کی پروازیں بند ہو چکی ہیں۔ لہٰذا مجھے بھی تاشقند میں بند ہونا پڑا۔ اب سوچا کہ چلو فون پر لاہور اطلاع کرتا ہوں اور اپنے سفرنامے کی پہلی قسط مجلۃ الدعوۃ کے لیے روانہ کرتا ہوں۔ چنانچہ میں نے فتح اللہ سے کہا کہ یہ چند کاغذ ہیں ان کی فوٹوسٹیٹ کروانی ہے۔ پہلے تو اسے کچھ سمجھ نہ آئی کہ وہ کیا ہوتی ہے اور جب اس کی حقیقت اس کی سمجھ میں آئی تو پتا چلا کہ یہ مشین صرف حکومت کے خاص ادارے کے پاس ہوتی ہے، مارکیٹ میں تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اب مجبوراً انہی کاغذوں کو فیکس کے لیے دیا، یہ بھی سرکاری طریق

سے ہی ممکن ہے۔ بہر حال دو دن بعد پتہ چلا کہ آپ کی فیکس نہیں جا سکی، دو دن اور انتظار کریں۔ اسی طرح ٹیلیفون کرنے کے لیے بھی دو دن پہلے بکنگ ضروری تھی۔ یہ صورت حال جو کہ روسی دور میں تھی ہنوز جاری ہے۔ جس طرح برصغیر کے مسلمانوں نے پاکستان کا مطلب کیا "لا الہ الا اللہ" کا نعرہ بلند کر کے ملک تو حاصل کر لیا مگر وہ ملک انگریز نے ان ہاتھوں میں دیا جو ان کے نظام کے دلدادہ اور اس کی یونیورسٹیوں میں پڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ آج نصف صدی سے پاکستان ان دیسی جمہوری انگریزوں اور پاکستان میں اسلام کو غالب دیکھنے والوں کے درمیان کھینچا تانی کا باعث بنا ہوا ہے، جبکہ کنٹرول انگریز ہی کے وارثوں کا ہے۔ یہی صورت حال ان ریاستوں کو بھی درپیش ہے کہ افغان جہاد کی برکت سے یہ علاقے آزاد تو ہو گئے مگر روسیوں نے جاتے ہوئے کنٹرول انھیں کو دیا جو کمیونزم کے علمبردار تھے اور ماسکو کی یونیورسٹیوں کے پڑھے ہوئے ہیں اور اب تقریر کرتے ہوئے "بسم اللہ پڑھ" رہے ہیں...... بہر حال ان کے مابین کشمکش موجود ہے، تاجکستان میں تو یہ کشمکش مسلح صورت حال اختیار کر گئی ہے جبکہ باقی ریاستیں جلد یا بدیر اس زد میں ہیں۔ اس لیے یہ علاقے مستقبل میں انقلاب کے کتنے مرحلوں سے گزریں گے یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے جبکہ ان کے رونما ہونے میں دو آراء نہیں ہیں۔ اس لیے کہ یہ ایک فطری عمل ہے جسے روکا نہیں جا سکتا، مسلمان اس وقت اسلام کے حوالے سے اپنی پہچان کی فکر میں ہیں اور یہ کام وہاں جاری ہے اور اس مقصد کے لیے مسلمانوں اور علماء کی مدد اور راہ نمائی بھی انھیں درکار ہے۔ وہ اس مقصد کے لیے کوشاں ہیں جبکہ حکومتیں ابھی سے خائف ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ بہر حال یہ بات طے ہے کہ وہ اسلام کہ جو منظم الحادی حکومت کے بے پناہ مظالم کے باوجود ستر سال بعد بھی اسی طرح زندہ ہے جس طرح وہ ستر سال قبل زندہ تھا تو اب موجودہ حکومتیں جو شکست خوردہ روس اور اس کے الحادی نظریے کی باقیات ہیں ان سے اسلام بھلا کیوں کر دبے گا۔ اسلام اب اللہ کے فضل سے ابھرے گا اور جہادی راستے سے ہی ابھرے گا۔

روس میں بغیر ویزے کے میرا گھومنا پھرنا اس بات کا شاہد ہے، افغانستان سے ہوکر روس میں جانا اس حقیقت کی صاف، کھلی اور روشن دلیل ہے۔ اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد میں ۱۲ ستمبر کو بارہ بجے کے قریب ازبکستان ایئر لائن کے جمبو جہاز پر بیٹھ چکا تھا، عصر کے قریب کراچی ایئر پورٹ پر اترا اور ساڑھے چھ بجے لاہور شہر میں تھا۔

اب میں اپنے اس ملک پاکستان میں تھا کہ جو روس کے خلاف افغان بھائیوں کے قدموں کے ساتھ قدم اور کندھے کے ساتھ کندھا ملا کر کھڑا ہوگیا، اس جہادی صف بندی میں سعودیہ بھی شامل تھا۔ بڑی دیر بعد یہ پہلا موقع تھا کہ افغانستان کے مسئلہ کا حل جہاد کے راستے سے تلاش کیا گیا۔ اب چونکہ یہ اللہ کے رسول ﷺ کا راستہ ہے، اللہ کا پسندیدہ راستہ ہے چنانچہ اس راستے سے اللہ نے افغانستان میں اس امت کو روسی ریچھ کے دانتوں سے نکال کر واپس ہی نہیں لوٹایا بلکہ وسط ایشیا کے پانچ ملک بھی اللہ نے ''جھونگے'' میں مسلمانوں کی جھولی میں ڈال دیے۔ پاکستان کو اب پھر ایک جنرل اختر عبد الرحمٰن کی ضرورت ہے، انڈیا کے خلاف سینہ سپر ہونے کی ضرورت ہے، روس توڑنے کے بعد اب انڈیا توڑنے کی ضرورت ہے، یہ بھی ٹوٹے گا تو جہاد کی برکت سے ٹوٹے گا اور اس کے ٹوٹنے کے بعد جھونگے میں کیا کچھ اسلامیان پاکستان کی جھولی میں گرنے والا ہے، اسے اللہ ہی جانتا ہے۔ لگتا ہے فرشتے ہاتھوں میں تحفے تھامے کھڑے ہیں کہ کب ہم اس راستے پر چلیں اور کب تحائف کے وارث بنیں۔

یقیناً ان تحائف کے ہم حقدار بن سکتے ہیں اگر ہم پوری قوم کو مجاہد قوم بنا ڈالیں۔ روسی کفار جو دنیا پر چھا گئے، تو اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنی قوم کے ہر فرد کو لڑاکا بنادیا، روسی حکمرانوں نے ہر نوجوان کے لیے دوسال کی فوجی ٹریننگ لازمی قرار دے رکھی ہے یعنی باقاعدہ تنخواہ دار فوج کے علاوہ پوری قوم کے ہر نوجوان کو بے قاعدہ سپاہی بنادیا۔

آہ! یہ تو وہ وصف ہے جس سے مسلمان متصف تھے اور اسی وصف سے تو پوری دنیا پر

چھا گئے تھے۔ مگر آج وہ اس سے تہی دامن ہیں اور ان کا یہ وصف کفار اپنا چکے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جھنجوڑتے ہوئے حکم دیتے ہیں:

''(مسلمانو!) مشرکوں سے سب اکٹھے ہو کر لڑو جیسا کہ وہ تم سے اکٹھے ہو کر لڑتے ہیں۔'' (التوبة: ٣٦)

غور کیجیے! اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ہر فرد کو مجاہد دیکھنا چاہتا ہے اور جو مجاہد بننا نہیں چاہتا تو اللہ کے رسول ﷺ اس کے لیے یہ وعید سناتے دکھائی دیتے ہیں:

''جس نے نہ جہاد اور نہ ہی اس کے دل میں جہاد کا خیال پیدا ہوا وہ مر گیا تو منافقت کے (مختلف شعبوں میں سے) ایک شعبے پر مر گیا۔'' (مسلم)

امت مسلمہ کے ہر فرد کے ذہن میں یہ حقیقت نقش ہو جانی چاہیے کہ یہ وہ امت ہے کہ جس کے ہاں نماز جیسی عبادت بھی اپنے جلو میں جہاد کا جلال لیے ہوتی ہے۔ ''صحیح بخاری، کتاب العیدین'' میں ذرا ملاحظہ کیجیے آخری جہادی امت کے آخری رسول امام المجاہدین ﷺ کی نماز عید:

''اللہ کے رسول ﷺ صبح کے وقت جائے نماز کی طرف چلتے تو آپ کے آگے آگے نیزہ اٹھایا ہوا ہوتا پھر وہ جائے نماز کے قریب آپ کے سامنے گاڑ دیا جاتا، آپ ﷺ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھاتے۔''

قارئین کرام! عید کے پرمسرت موقع پر مسلمان کھیل بھی کھیلتے تو وہ جہادی کھیل ہوتے، اللہ کے رسول ﷺ دیکھتے اور خوش ہوتے، نشانہ بازی تو اللہ کے رسول ﷺ کو بہت پسند تھی۔ چنانچہ فرمایا:

''جس نے نشانہ بازی کو سیکھا پھر اسے چھوڑ دیا تو وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''

قارئین کرام! اب ذرا موازنہ کیجیے روس اور افغانستان کے درمیان اور پھر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے جہادی فرامین کی صداقت دیکھیے جہادی میدانوں میں ...... کہ روس نے

اپنی قوم کے ہر فرد کو فوجی بنایا، وہ سپر پاور تھا، وہ افغانستان میں آیا، ایک ایسی قوم پر حملہ آور ہوا کہ جس کا ہر فرد افغانی ثقافت کے مطابق اسلحہ سے محبت کرنے والا، نشانہ باز تھا۔ چنانچہ دونوں کا مقابلہ ہوا اور روس کو افغانیوں کے بچے بچے سے واسطہ پڑا اور یہی وہ حقیقت ہے، یہی وہ اسلامی ثقافت ہے کہ جس نے روس کا جنازہ نکال دیا اور یہی مسلمانوں کی وہ تہذیب اور تمدن ہے کہ جس سے وابستہ ہوکر وہ ہندوؤں اور صلیبیوں کے طاغوتی اور ظالمانہ چیلنجوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مسند احمد میں اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان بالکل واضح ہے، جس کے مطابق اگر مسلمان جہاد ترک کر دیں گے تو وہ مصیبتوں میں گرفتار ہو جائیں گے اور یہ مصائب اس وقت تک ختم نہ ہوں گے جب تک وہ جہاد کی جانب پلٹ نہیں آتے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہ افغانستان میں جہاد کی جانب جس قدر پلٹے اسی قدر ان کے مصائب چھٹ گئے اور اب اس امت کے نام اس کے رب اور رسول ﷺ کا یہی پیغام ہے کہ جس قدر تم جہاد میں آگے بڑھتے جاؤ گے مصائب کو اپنے قدموں تلے کچلتے چلو جاؤ گے، افغانستان کے بعد روس کے در و دیوار پر میں نے یہی کچھ لکھا ہوا دیکھا ہے، کسی دوسرے کو یہ لکھا ہوا دکھائی دیا کہ نہیں مگر مجھے تو بہر حال یہی لکھا ہوا دکھائی دیا ہے اور میں نے اسے اللہ کی توفیق سے لکھ دیا ہے امت مسلمہ کے ہر اس فرد کے نام جو اسلام کو سب دینوں پر غالب دیکھنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے ہتھیار کو اپنا زیور بنانا چاہتا ہے۔